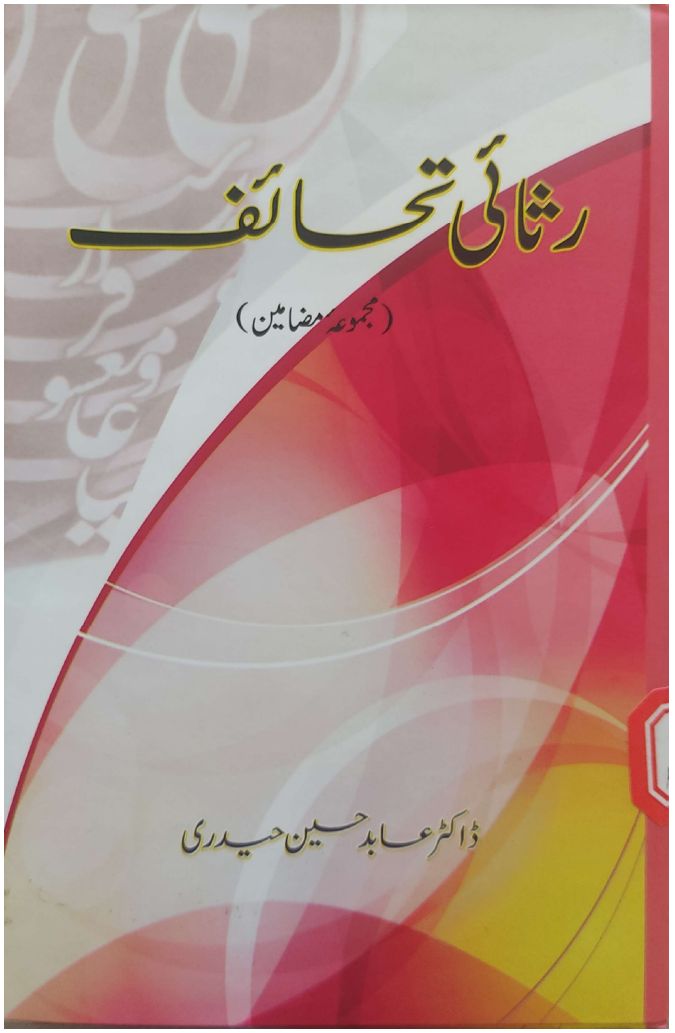

رثائی تحائف

رثائی تحائف

(مجموعۂ مضامین)

ڈاکٹر عابد حسین حیدری

©جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب : رثائی تحائف

مصنف : ڈاکٹر عابد حسین حیدری

ترتیب وانتخاب: محمد عالم

تعداد : 400

مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

کمپوزنگ : عبدالقوی

پیشکش : ایلیا پبلی کیشنز، عباسی ٹولہ کوٹ غربی، ضلع سنبھل، یوپی

زیرِنگرانی : ایم۔آر۔پبلی کیشنز

10 میٹروپول مارکیٹ، 2724-25 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

RESAI TAHAIF

by

DR. ABID HUSAIN HAIDARI

HOD Urdu M.G.M. (P.G.) College, Sambhal

Add: ALIYA MENTION, ABBASI TOLA, KOT (W)

Sambhal, 244302(U.P.) INDIA

Mob: 09411097150, E:mail-drabidhusain@gmail.com

ISBN: 978-93-83282-07-4

Edition :2015

Price: ` 250/-

Library Edition: ` 375/-

Printed & Published by

M. R. PUBLICATIONS

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor

Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 9810784549, 9873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

فہرست

- ابتدائیہ ۷
- دبیرؔ کی شعریات اور ماورائی فضا ۹
- میر انیسؔ اور زید پور ۱۹
- انیسؔ اور شخصی مرثیہ ۳۰
- روہیل کھنڈ کی شاعرات اور رثائی ادب ۴۸
- تخلیق، تحقیق اور تنقید کا مثلث (نفیسؔ، ادیبؔ اور مرزا جعفر حسین) ۶۹
- منبر انتقاد کا خطیب اعظم: نواب جعفر علی خاں اثرؔ ۱۰۳
- فراستؔ زید پوری کے اجتہادات ۱۲۶
- دبستان زید پور اور محسنؔ زید پوری ۱۳۸
- خاندان اجتہاد کا امّی شاعر: چھنگا صاحب حسینؔ لکھنوی ۱۲۷
- فقیہؔ شافعی کی 'روضاۃ البکا' ۱۸۳
- حسینی درشن اور شفقؔ شادانی ۱۹۶
- عشرتؔ لکھنوی کے مرثیوں کی سماجیات ۲۰۵
- 'ایک قطرہ خون' پر ایک نظر ۲۲۱
- مختصر سوانحی خاکہ ۲۳۳

انتساب

رثائی ادب کے پارکھی و محقق
ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا)

و

علامہ سید ارتضیٰ عباس نقوی
(مدیر 'جواہر' کراچی)

اور

رثائی ادب کے بےلوث محقق
جناب سید محمد رضا عابد رضوی
(مقبرہ عالیہ، گولہ گنج لکھنؤ)

کے نام

ابتدائیہ

’رثائی تحائف‘ میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو رثائی ادب کی آبرو و سرخیل انیسؔ و دبیرؔ کے علاوہ فراستؔ اور محسنؔ زیدپوری جیسے دبستان دبیرؔ کے شعرا کے فن پر سیر حاصل گفتگو بھی ہے۔ یہ مضامین متعدد سیمیناروں میں پڑھے گئے مقالات ہیں یا کچھ کرم فرماؤں جیسے علامہ ارتضیٰ عباس نقوی (مدیر ’جواہر‘ کراچی)، جناب سراج نقوی، جناب لئیق رضوی اور ڈاکٹر حسن مثنیٰ کی فرمائشوں پر لکھے گئے ہیں۔ یہ مضامین نہ صرف یہ کہ تحقیقی نوعیت کے حامل ہیں بلکہ رثائی ادب کے رنگارنگ پہلو کی بھی سیر کراتے نظر آتے ہیں، جیسے دبیرؔ پر لکھا گیا مضمون جہاں الگ نوعیت کا حامل ہے وہیں انیسؔ پر لکھے گئے مضامین انیسؔ کی مرثیہ نگاری کے دوسرے پہلو یعنی شخصی مرثیہ نگاری سے قارئین کو روشناس کراتے ہیں۔ ’روہیل کھنڈ کی شاعرات اور رثائی ادب‘ عالمی سہارا دہلی نے محرم پر خصوصی طور پر شائع کیا جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مردوں کے شانہ بہ شانہ خواتین نے بھی رثائی ادب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ’تخلیق، تحقیق اور تنقید کا مثلث (نفیسؔ، ادیبؔ اور مرزا جعفر حسین)‘ جواہر کراچی کے مدیر علامہ ارتضیٰ عباس نقوی کی فرمائش پر ’نفیسؔ نمبر‘ کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ مضمون ذخیرۂ ادیبؔ مرحوم میں نفیسؔ کے مراثی کے متعدد نسخوں کی نشاندہی کرتا ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے ساتھ ہی ساتھ ادیبؔ اور مرزا جعفر حسین کے تحقیقی و تنقیدی نظریات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ نواب جعفر علی خاں اثرؔ جو ماہر لسانیات، لغت نویس اور

استاد شاعر ہونے کے ساتھ انیسؔ شناسی کا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے جب انیسؔ ناشناسی کا ثبوت دیتے ہوئے ’نگار‘ میں مضامین تحریر کیے تو اثرؔ نے اس کا مدلل جواب لکھا۔ ’منبر انتقاد کا خطیب اعظم: نواب جعفر علی خاں اثرؔ‘ میں احسن فاروقی اور اثرؔ کی تحریروں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اردو شاعری میں اخلاقی شاعری کی سب سے بہترین مثال انیسؔ کا کلام ہے۔ اسی طرح چھنگا صاحب حسینؔ، ’فقیہ شافعی کی روضاۃ البکا‘، ’حسینی درشن اور شفقؔ شادانی‘ اور ’عشرتؔ لکھنوی کے مرثیوں کی سماجیات‘ رثائی ادب کے قارئین کی توجہ کا مرکز بنیں گے۔ ۲۰۱۵ء عصمت چغتائی کی صدی تھی۔ ان کا مشہور ناول ’ایک قطرہ خون‘ رثائی ادب کا ایک ایسا شاہکار ہے جس سے ان کی شخصیت کا ایک دوسرا پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ یہ مضمون رثائی ادب کے قارئین کے لیے تحفہ بھی ہے اور اس عظیم مصنفہ کی خدمت میں خراج عقیدت بھی۔

آخر میں ان تمام حضرات کا شکریہ بھی ادا کرنا ضروری ہے جنھوں نے ان مضامین کی ترتیب و تدوین میں کسی نہ کسی انداز سے مددگار بنے ہیں خاص کر اہلیہ شہزادی بیگم اور اپنے بچوں محمد مفید و کمیل عابد اور بیٹیوں زینت زہرا و ایلیا زہرا سلمہم کا جنھوں نے گھر کے ماحول کو پُرسکون رکھ کر کاروبارِ ادب میں بھرپور معاونت کی۔ خداوند عالم بطفیل محمدؐ و آل محمدؐ زندگی کے ہر مرحلے پر انھیں کامیاب و کامران بنائے، آمین۔

خادم درِ آل نبیؐ
ڈاکٹر عابد حسین حیدری
صدر شعبۂ اردو
ایم.جی.ایم پی جی کالج، سنبھل

مورخہ ۱۲/اپریل ۲۰۱۵ء

دبیرؔ کی شعریات اور ماورائی فضا

مافوق الفطرت اور مابعد الطبعیات عناصر پر مشتمل قصے اور کہانیاں بچوں ہی نہیں بلکہ بزرگ اور پختہ شعور کے لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بھی رہی ہیں ۔نا معلوم کی تلاش اور جستجو بشری فطرت کا خاصہ ہے۔نا معلوم خواہ کتنا ہی ہیبت ناک کیوں نہ ہو لیکن انسان جستجو کی پرتیں کھولنے میں ایک خاص طرح کی لذت محسوس کرتا ہے۔کوہ قاف میں صرف پریاں نظر نہیں آتیں، دیو اور ساحروں سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے، اس کے باوجود انسان کوہ قاف کی کہانیوں سے گھبراتا نہیں بلکہ یہ دیو اور ساحروں کی دہشت انگیز شبیہیں اس ماورائی فضا کی تشکیل کا اہم حصہ ہیں جس میں ناظر یا قاری ایک خاص لذت محسوس کرتا ہے لیکن اسرار و تجسس کی یہ تصوراتی کائنات، کائنات وجودی سے غنی و بے نیاز نہیں ہوتی بلکہ کائنات موجود اور کائنات معلوم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔

شاعری میں ماورائے عقل کائنات کی تشکیل خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ تشکیل دو سطحوں پر ہوتی ہے، کبھی براہِ راست بیانیے کی بنیاد پر اور کبھی بالواسطہ انداز میں، جو اپنے اندرونی معنی بھی رکھتا ہے۔ مثنوی سحرالبیان اور گلزار نسیم پہلے قبیل کی مثالیں ہیں تو مصورؔ سبزواری کے یہ اشعار دوسرے قبیل کی ترجمانی کرتے ہیں:

نہ کھینچنی تھی تمہیں سطح آب کی چادر
کبھی کا گھات میں بیٹھا بھنور نکل آیا

جو چیخ ماری ہواؤں نے پار اترتے ہوئے
وہی کٹا ہوا دریا سے سر نکل آیا

یہاں جہان معنی کی تشکیل کے لئے جتنا کام شاعر کرتا ہے اتنا ہی قاری یا سامع کا ذہن بھی۔ بقول ایزر:

''معنی نہ تو کاغذ پر چھپے ہوئے لفظ میں ہیں نہ متن سے باہر ہیں۔معنی قاری کے سمجھنے کے عمل میں ہیں..... یوں معنی کوئی شئ نہیں جسکی تعریف قائم ہو سکے۔معنی اثر ہے جس کا فقط تجربہ کیا جاتا ہے۔''

(بحوالہ ساختیات پس ساختیات: پروفیسر گوپی چند نارنگ: صفحہ ۲۹۸)

اردو شاعری میں ماورائی فضا کی تشکیل کوئی نئ چیز نہیں ہے۔مثنویوں میں یہ بہت پہلے سے موجود ہے۔اردو غزل اور دوسری اصناف میں بھی یہ کوشش کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے لیکن مثنوی کے بعد یہ عمل سب سے زیادہ مرثیے میں دکھائی دیتا ہے۔ضمیرؔ، خلیقؔ اور فصیحؔ کے یہاں یہ فضا موجود ہے لیکن میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے داستان گوئی اور اساطیر کی مروجہ ماورائی فضا سے الگ جس ماورائی شعری فضا کی تشکیل کی، اس کی بنیاد مفروضات یا اساطیر پر نہیں، مشاہدے، معلومات اور تاریخی و علمی بصیرتوں کی بنیاد پر تھی۔مرزا دبیر کا مشہور زمانہ مرثیہ:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

اپنے قول کی تائید میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ اس مختصر مضمون میں مکمل مرثیے کا تجزیہ نہیں کیا جا رہا ہے۔

دبیرؔ نے مرثیے کے مطلع کے پہلے مصرعہ ہی سے اس فضا کی تشکیل کی ہے جسے ہم ماورائی فضا کہہ سکتے ہیں۔کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے .....ایک خبر ہے

جس خبر نے وقت کی رفتار کو غیر یقینی بنا دیا ہے اور یہ ساعت نہ ٹھٹکی ہوئی ہے، نہ اپنے محور پر ہے۔ اب جو کچھ تاریخی حقیقتیں اور اساطیری مفروضات وجود میں ہیں ان سب مفروضات و تصورات اور حقیقتوں کی معنویت متزلزل ہے:

رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے
ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے
سب ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

یہ تینوں مصرعے اُسی ماورائی فضا کی تشکیل میں معاونت کر رہے ہیں۔

اس بند کی بیت میں تلمیح کے حوالے سے حضرت جبرئیلؑ کا خوف اور موجود لمحے میں ہیبت کی فضا کی تشکیل میں دبیرؔ نے اپنی عالمانہ صناعی کے جوہر دکھائے ہیں:

شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریلؑ لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

یہ ایک ایسی فضا ہے جس میں وقت کی رفتار محور پر نہیں ہے اور اس فضا میں جو کچھ ہے اس کے آگے بہت کچھ نہیں ہے اور جو کچھ نہیں ہے وہاں بہت کچھ کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ فضا نہ یقین ہے نہ بے یقینی، کتنے یقین بے یقینیوں میں اور کتنی بے یقینیاں یقین میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہیں۔ کتنے نامعلوم محسوس ہونے لگتے ہیں اور کتنے معلوم نامعلوم۔ گویا سب کچھ معلوم ہے۔ سیّارگانِ وقت کی گردش ٹھہری ہوئی ہے یہاں تک کہ:

ہیبت سے ہیں نُہ قلعۂ افلاک کے در بند
جلاّدِ فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند
واہے کمر چرخ سے، جوزا کا کمر بند
سیّارے ہیں غلطاں صفتِ طائرِ پَر بند

انگشت عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے
خورشید کے پنجے سے علم چھوٹ پڑا ہے

اس بے یقینی اور یقین کی فضا میں:

خود فتنہ و شر پڑھ رہے ہیں فاتحۂ خیر
کہتے ہیں انا العبد لرز کر صنمِ دیر
جاں غیر ہے تن غیر، مکیں غیر مکاں غیر
نَے چرخ کا ہے دور، نہ سیّاروں کی ہے سیر
سکتے میں فلک خوف کے مانند زمیں ہے

لیکن اس نامعلوم فضا میں ایک چیز دبیرؔ کو معلوم ہے، جو انتہائی نامعلوم شئ ہے:

جز بخت یزید اب کوئی گردش میں نہیں ہے

یہاں خوف اور ہیبت کا قسمت سے جو نفسیاتی تعلق ہے اس کا تجزیہ بھی بہت ضروری ہے۔ خوف یا ہیبت حال ہے، ڈر مستقبل کا ہوتا ہے ماضی کا نہیں..... چونکہ ماضی ہمیشہ ایک دبیز رومانیت کی ردا اوڑھے رکھتا ہے۔ خوف رفت کا نہیں آئند کا ہوتا ہے، اس لئے ہیبت کی فضا قائم کرتے ہوئے دبیرؔ نے قسمت، اس کی تشکیل اور اس کے مظہرات کا ذکر خاص طور سے کیا ہے۔

چونکہ قسمت آئند کا استعارہ ہے۔ قلعۂ افلاک، جلاّدِ فلک، جوزا، سیّارے، منشی فلک عُطارد، چرخ، بخت اور طالع خصوصی اہمیت کے حامل ہیں اور لمحۂ خوف سے آئند کے رشتے کی دونوں طرفوں کا مطالعہ بھی۔ ایسی صورت میں ''بیداری طالع عباس'' اور ''گردش بخت یزید'' دونوں کا تذکرہ بھی بڑا معنی خیز ہے۔ ان دونوں کو بیان کرنے کے لئے جس ماحول اور منظر نامے کو قائم کرنے کی ضرورت ہے اس کے تحت پہلے بند سے ۲۵ ویں بند تک

دبیرؔ کا کوئی مصرع، کوئی استعارہ، کوئی تلمیح یا کوئی لفظ حشو نہیں معلوم ہوتا۔ گویا دبیرؔ لفظ لفظ، قدم قدم اس منظر نامے کی تعمیر کرتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے ہیں جس فضا میں وغائے حضرت عباسؑ کو وقوع پذیر ہونا ہے۔ اس لئے بے شمار فوج اور بے کنار لشکر کے جلا جل وقرنا وبُوق ودُہل اور کوس کے شور کے مقابل ایک بے کس و بے لشکر کی آمد کی ہیبت سے پیدا شدہ سکتے اور خامشی کے قدموں کی آہٹ کو دبیرؔ نے آمد کی نوبت بجنے سے تعبیر کیا ہے اور یہ دبیرؔ کی اعلیٰ ترین صناعی کے ان ادنیٰ ترین نمونوں میں سے ایک ہے جس کے لئے دبیرؔ پہچانے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے عام عقیدہ کے مطابق سب سے زیادہ نامعلوم یقین قسمت ہے جو اللہ کا ذاتی علم اور اختیار ہے۔ لیکن دبیرؔ کی تشکیل کردہ فضا میں ؎

انگشت عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے

گویا آج کے اس موجودہ لمحے میں منشی فلک کا کام ''عطارد'' کو نہیں ''تیغ عباسؑ'' کو کرنا ہے۔ چونکہ برق، سمندِ حضرتِ عباسؑ کی ہیبت سے بے ہوش ہے تو آج برق کہاں گرنی ہے۔ یہ بات برق طے نہیں کرے گی بلکہ سمندِ حضرتِ عباسؑ طے کرے گا۔ تجلی آفتاب سے خیرہ ہونے والی نگاہیں پنجۂ علم عباسؑ کی جلالت سے روپوش آفتاب کو تلاش کرنا چاہیں تو نہ کر پائیں گی۔ اس لئے کہ آج کی ضیا باری تجلی پنجۂ عباسؑ کی مرہون منت ہے۔ یہاں سے مشیت میں تصرفات حضرتِ عباسؑ کی خبر یہ بند بن جاتے ہیں:

بے ہوش ہے بجلی، یہ سمند ان کا ہشیار
خوابیدہ ہیں سب طالع عباس ہے بیدار
پوشیدہ ہے خورشید، علم ان کا نمودار
بے نور ہے منھ چاند کا، رخ ان کا ضیا بار

سب جزو ہیں، کل رتبے میں کہلاتے ہیں عباسؑ
کونین پیادہ ہیں، سوار آتے ہیں عباسؑ

چمکا کے مہ و خور، زر و نُقرہ کے عصا کو
سرکاتے ہیں پیر فلک پشت دوتا کو
عدل آگے بڑھا، حکم یہ دیتا ہے قضا کو
ہاں باندھ لے ظلم و ستم و جور و جفا کو
گھر لوٹ لے بغض و حسد و کذب و ریا کا
سر کاٹ لے حرص و طمع و مکر و دغا کا

اس ماورائی فضا کی تشکیل میں تشبیہات، تمثیلات، محاکات، تلمیحات اور استعارات کا جو مربوط نظام دبیرؔ کے یہاں ہے وہ کئی سطحوں پر متحرک نظر آتا ہے یہیں پر دبیرؔ نے تشکیل اور ردِ تشکیل، تشبیہ اور ردِ تشبیہ اور انکار معانی سے بہت بڑا کام لیا ہے۔ بیانیہ میں جب حضرت عباسؑ کے سراپا کا تذکرہ کرتے ہیں تو دبیرؔ کی صناعی اور طباعی قابل دید ہے:

گو خلعت تحسیں مجھے حاصل ہے سراپا
پر وصف، سراپا کا تو مشکل ہے سراپا
ہر عضوِ تن اک قدرت کامل ہے سراپا
یہ روح ہے سر تا بہ قدم، دل ہے سراپا
کیا ملتا ہے گر کوئی جھگڑتا ہے کسی سے
مضمون بھی اپنا نہیں لڑتا ہے کسی سے

اس کے بعد کئی بندوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دبیرؔ نے سراپا میں بھی کس طرح کی فضا قائم کی ہے، یہاں پر صرف دو بند ملاحظہ فرمائیں:

سورج کو چھپاتا ہے گہن آئینے کو زنگ
داغی ہے قمر سوختہ دل لالۂ خوش رنگ
کیا اصل در و لعل کی وہ پانی ہے یہ سنگ
دیکھو گل و غنچہ، وہ پریشاں ہے یہ دل تنگ
اس چہرے کو داور ہی نے لاریب بنایا
بے عیب تھا خود نقش بھی بے عیب بنایا

آئینہ کہا رُخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی
صنعت وہ سکندر کی، یہ صنعت ہے خدا کی
واں خاک پہ صیقل، یہاں قدرت نے جلا کی
طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی
ہر آئینہ میں چہرۂ انساں نظر آیا
اس رُخ میں جمال شہِ مرداں نظر آیا

یہاں پر ''ایک لمحے'' اور ''کائنات'' کے مابین دو طرفہ مجرد رشتوں کی گفتگو بھی بے معنی نہ ہوگی۔ ایک لمحے نے فضائے کائنات پر جو اثرات مرتب کئے ہیں اور کائنات کی ہر شئے اس لمحے کو جس انداز میں دیکھ رہی ہے اس کو بیان کرنے میں دبیرؔ کو یدطولیٰ حاصل رہا ہے۔ ایسے کسی بھی لمحے کو بیان کرتے وقت دبیرؔ ہمیشہ لمحے اور وقت، لمحے اور کائنات دونوں کے مابین رشتے کی دونوں طرفیں بآسانی کھول دیتے ہیں۔ اس فضائے اضطرار میں جہاں 'نہ قلعۂ افلاک' بند ہو چکے ہوں، سیارے پر سمیٹے طائروں کی مانند بیٹھے ہوں، وہاں فتنۂ وشر کا اضطرار، اصنام دیر کا اضطراب، گردش بخت یزید اور طالع حضرت عباسؑ کا بیدار ہونا، یہ تضاد منظر نہیں بلکہ منظر کی دونوں طرفوں کو کھولنے کی ایک کامیاب کوشش نظر آتی ہے اور اسی سے

اس ماورائی فضا کی تشکیل بھی ہوتی ہے جس فضا میں :

راحت کے محلوں کو بلا پوچھ رہی ہے
ہستی کے مکانوں کو فنا پوچھ رہی ہے
تقدیر سے عمر اپنی قضا پوچھ رہی ہے
دوزخ کا پتہ، فوجِ جفا پوچھ رہی ہے
غفلت کا تو دل چونک پڑا خوف سے مل کر
فتنے نے کیا خواب، گلے کفر سے مل کر

ہے شور فلک کا کہ یہ خورشید عرب ہے
انصاف یہ کہتا ہے کہ چپ! ترک ادب ہے
خورشید فلک، پرتوِ عارض کا لقب ہے
یہ قدرتِ رب، قدرتِ رب، قدرتِ رب ہے
ہر ایک، کب اس کے شرف و جاہ کو سمجھے
اس بندے کو وہ سمجھے جو اللہ کو سمجھے

اس کے بعد کے کئی بند اپنی معنویت کے لشکر کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں جو ماورائی فضا کی تشکیل میں معاون بنتے جاتے ہیں اور ۲۵ بندوں تک یہ فضا پھیل کر ایک مکمل کائناتِ تصور بن جاتی ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل دید ہے کہ حضرت عباسؑ کا سراپا بیان کرتے ہوئے تلمیحات اور استعارے تراشنے میں دبیرؔ کا ماہر قلم اور بھی تیز رفتار ہو جاتا ہے۔ بطور مثال یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

یوسفؑ ہے یہ کنعان میں، سلیماںؑ ہے سبا میں
عیسیٰؑ ہے مسیحائی میں، موسیٰؑ ہے دعا میں

ایوبؑ ہے یہ صبر میں یحییٰؑ ہے بکا میں
شبیرؑ ہے مظلومی میں، حیدرؑ ہے وَغا میں
کیا غم، جو نہ مادر نہ پدر رکھتے ہیں آدمؑ
عباسؑ سا دنیا میں پسر رکھتے ہیں آدمؑ

یہاں تصور کو یقین کا روپ دینے کے لئے دبیرؔ نے اپنے مطالعات ومشاہدات سے خوب کام لیا ہے:

صحرا میں گرا، پرتو عارض، جو قضا را
سورج کی کرن نے کیا شرما کے کنارا
یوں دھوپ اڑی آگ پہ جس طرح سے پارا
موسیٰ کی طرح، غش ہوئے سب، کیسا نظارا
جز مدح، نہ دم روشنی طور نے مارا
شب خون، عجب، دھوپ میں اس نور نے مارا

قرآن ہوائے علم شاہ امم کے
سب خار ہرے ہو کے بنے سرو، ارم کے
ہیں راز عیاں، خالق ذوالفضل وکرم کے
جبریلؑ نے پر کھولے ہیں دامن میں علم کے
پرچم کا جہاں عکس گرا صاعقہ چمکا
پرچم کہیں دیکھا نہ سنا اس چم وخم کا

قرنا میں نہ دم ہے نہ جلاجل میں صدا ہے
بوق و دہل وکوس کی بھی سانس ہوا ہے

ہر دل کے دھڑکنے کا، مگر زور بپا ہے
باجا جو سلامی کا اسے کہیے، بجا ہے
سکتے میں جو آواز ہے نقارۂ ودف کی
نوبت ہے درودِ خلفِ شاہِ نجف کی

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ یہ مختصر مضمون ہے مقالہ نہیں۔ مرثیے کے بند، مصرعے اور اس کی لفظیات وفنی محاسن پر گفتگو کبھی اور ہوگی۔ مرثیے کا تجزیاتی مطالعہ بھی کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھیے۔ فی الوقت دبیرؔ کی تشکیل کردہ ماورائی فضا پر گفتگو کرتے ہوئے صرف اتنا عرض کروں گا کہ شاید ہم نے اس ماورائی دنیا کی جیتی جاگتی تصویریں دیکھ لی ہیں جس کا ہم نے مشاہدہ نہیں کیا ہے لیکن جس کا پیکر ہمارے حواس کے آئینے میں صاف نظر آتا ہے۔

○○○

میر انیسؔ اور زید پور

کچھ جگہیں ایسی ہوتیں ہیں جن کی شناخت ان کا جغرافیائی حدود نہیں ہے بلکہ ان کا علم و فضل ہوتا ہے۔ اودھ کی راجدھانی لکھنؤ سے تقریباً ۴۵ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ضلع بارہ بنکی کے قصبہ زید پور کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے ریاست و امارت کے ساتھ ادب و شاعری میں بھی اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ نوسو برس سے زائد عمر کی یہ علمی و ادبی بستی ہمیشہ سے علماء ادباء اور شعراء کی آماجگاہ رہی ہے اور اس کی علمیت کا شہرہ نہ صرف ہندوستان بلکہ سرحد پار تک پہنچا اور یہاں کے شعراء اور اہل علم و دانش کے علمی اکتسابات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ رثائی ادب کے مشہور پارکھی ڈاکٹر ہلال نقوی نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

''ہندوستان کے بہت سے مقامات کی طرح زید پور بھی وہ جگہ ہے جسے مرثیے کے ایک پلیٹ فارم کی حیثیت دی جا سکتی ہے''(۱)

مفتی محمد عباس مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (غدر) کے پرآشوب دور میں قیام زید پور کے دوران کچھ اشعار کہے جس سے زید پور کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

درانجا است پانصد نفر پور زید
نہ مانند بو زید پر مکر و شید
کہ اہل نیاز اند و مہماں نواز

ہمہ پاک دین و ہمہ پاک باز
ولیکن من از گردش آسماں
دراں سرزمیں ہم ندیدم اماں (۲)

مرحوم سید سبط محمد نقوی نے ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''حضرات زید پور اس پر جتنا فخر کریں کم ہے کہ انہوں نے ایسے علامہ اجل کی مہماں نوازی کی اور ان کے قلم حقیقت رقم سے نہ صرف ''نیاز مندی و مہماں نوازی'' بلکہ ''پاک دینی و پاک بازی'' کی بھی سند پائی۔ یہ سند ایک دو کے لئے نہیں جناب مفتی صاحب نے ''ہمہ'' کی وسعت میں ان کا احاطہ کیا ہے''(۳)

لکھنؤ کی جس علمی اور ادبی وراثت پر ہم فخر کرتے ہیں اگر اس کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوگی کہ اس کا بڑا سرچشمہ اطراف و جوانب کے قصبات ہیں جنہوں نے لکھنؤ کو لکھنؤ بنانے میں اہم کارنامے انجام دیے۔ زید پور لکھنؤ سے دور نہ تھا۔ لکھنؤ کے ادبی ماحول اور عزائی فضا نے اس بستی کو بھی متاثر کیا جس کے نتیجے میں زید پور سے اہل دل کارواں در کارواں جاتے تھے اور نقدِ دل کے عوض اس جنس نایاب کے خریدار بن کر عاشقان دل باختہ کے محضر میں شامل ہو جاتے تھے۔ جس کے نتیجے میں انیسویں اور بیسویں صدی میں زید پور میں مداحان اہلبیتؑ کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے جن میں انیسؔ کے زیر اثر شعراء کی معتد بہ تعداد دکھائی دیتی ہے۔ آگے چل کر رثائی ادب کے نقشے پر زید پور نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی اور وقارؔ، فراستؔ، یونسؔ، اکملؔ، زارؔ، زائرؔ، محسنؔ، منتصرؔ اور غلام عباس ناصرؔ جیسے مرثیہ نگاروں نے دبستان زید پور کی نمائندگی کی اور اس کو ایک اہم دبستان

بنادیا جس پر فخر کرتے ہوئے مؤدتؔ زیدپوری نے کہا:

لکھنؤ کی مرکزیت ہم کو بھی تسلیم ہے
ہے مگر کچھ اور ہی طرز فغان زید پور
آب کوثر سے وہ طاہر اور یہ تسنیم سے
وہ زبان لکھنؤ ہے یہ زبان زید پور

جہاں تک زید پور کی علمی و ادبی روایت کا تعلق ہے اس مومن خیز بستی نے علماء افاضل اور مداحان اہلبیتؑ کی بہت بڑی تعداد پیدا کی ہے بقول مرحوم سید سبط محمد نقوی:

''بلا خوف تردید عرض کیا جا سکتا ہے کہ روساء علماء
افاضل اور مداحان اہلبیتؑ کی ایسی مسلسل روایت کسی
دوسری بستی نے کم ہی پیش کی ہوگی'' (۴)

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے ''دبستان دبیر'' میں سید سبط محمد نقوی کی تائید درج ذیل الفاظ میں کی ہے۔

''زید پور ہمیشہ سے علم و ادب کا مرکز رہا ہے'' (۵)

انیسؔ اور زید پور

دراصل زید پور کی لغت میں علم، ادب اور دین ایک ہی لفظ کے تین مفہوم ہیں۔ یوں تو اس بستی کے شعراء نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن یہاں کے زیادہ تر شعراء نے مذہب کے غلبہ کی وجہ سے مذہبی یا عزائی اصناف ہی میں اپنے جوہر دکھائے۔ چونکہ زید پور کے شعراء نے بالواسطہ یا بلا واسطہ انیسؔ و دبیرؔ سے کسب فیض کیا ہے اس لئے اس بستی میں ان دونوں صاحبان کمال کے زیر اثر شعراء کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔ علی احمد دانشؔ اس تعلق کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں :

''یہاں کے عوام و خواص ہمیشہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی طرف مائل رہے۔ وہاں کے بعض افراد تو مرزا دبیرؔ کی طرف مائل تھے مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہاں انیسؔ کے ماننے والے نہ ہوں ۔ خصوصاً میر فضل علی وقارؔ تلمیذ انیسؔ و نفیسؔ (۶) وہاں کے ممتاز شعراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ انہیں کی وجہ سے میر انیسؔ سفر کی زحمت اٹھاتے اور وہاں مجلس پڑھنے جاتے تھے'' (۷)

علی احمد دانشؔ نے ڈاکٹر محمد علی رضوی مرحوم کا بیان نقل کیا ہے کہ:

''میر انیسؔ صاحب ایک بار اس قصبہ میں تشریف لائے تھے۔ یہ بات انہوں نے اپنے ایک بزرگ سے سنی تھی، اس زمانے میں نشست و برخاست کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا اور آداب محفل معین تھے۔ ڈاکٹر محمد علی مرحوم کے جد بزرگوار حکیم اتحاد حسین کا بیان تھا کہ میر انیسؔ اس دیوان خانے میں ٹھہرے جہاں میر علی صفیر صاحب کا مکان واقع تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ میر انیسؔ اپنی تین گھنٹے کی نشست میں جس انداز سے تشریف فرما تھے اسی طرح بیٹھے رہے۔ قصبہ کے ایک بزرگ اقدس حسین صاحب تھے جو متعدد مرتبہ حج و زیارت سے بہرہ مند ہو چکے تھے۔ میر انیسؔ ان سے حج کی تفصیلات معلوم کرتے رہے مگر اس گفتگو کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ میر انیسؔ حاجی صاحب سے اس طرح

بات کر رہے تھے جیسے وہاں کی جگہوں کی پوری طرح سے
واقفیت رکھتے ہوں ۔ حالانکہ میر انیسؔ نے حج نہیں کیا تھا
اور نہ زیارت کربلا سے مشرف ہو سکے ۔اس بات کا اظہار
انہوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ کیا ہے ۔ڈاکٹر محمد علی کا
بیان ہے کہ میر انیسؔ نے شاہ جی (۸) کے امامباڑے کی
تعمیر کے سلسلہ میں تاریخ کہی تھی:

امامباڑۂ فرزند شاہ قلعہ شکن (۱۵۱۲ء)

بہر حال زید پور کو یہ شرف حاصل ہے کہ میر انیسؔ نے
امامباڑہ گڑھی میں مرثیہ پڑھا'' (۹)

زید پور کی دینی اور ادبی روایت تو یقیناً بہت پرانی ہے لیکن یہاں کی مرثیہ گوئی کے ابتدائی نقوش ہماری معلومات کے حدود سے باہر ہیں ۔جس زمانہ سے مرثیہ گوئی کی مسلسل روایت ملتی ہے وہ انیسؔ و دبیرؔ سے استفادہ کا زمانہ ہے ۔زید پور کی مرثیہ گوئی انہیں دونوں با کمال کی مرہون منت ہے ۔ دبیرؔ سے بالواسطہ استفادہ کرنے والوں میں جانشین دبیرؔ اوجؔ کے شاگرد فراستؔ اور یوسؔ کے نام نامی مرثیے کی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں اور فیضان انیسؔ وقارؔ و بدرؔ کی شکل میں طلوع ہوا۔

انیسؔ کے سب سے اہم شاگرد قاری سید فضل علی وقارؔ (م ۱۰۔۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء) زید پور کے ایک معزز رئیس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے ۔ان کے دادا عابد حسین زید پور کے تعلقدار تھے ۔ وقارؔ کو فن تجوید اور علوم عربیہ پر عبور تھا۔ وہ بڑے پر گو مرثیہ نگار تھے ۔فروغؔ سیتاپوری نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

'' راقم جس زمانے میں میر نفیسؔ اعلی اللہ مقامہ کی خدمت

میں مرثیہ پڑھنے جاتا تھا تو وہاں اکثر سید فضل علی
وقارؔ موصوف سے نیاز حاصل ہوتا ۔آپ میرے حال پر
بہت شفیق تھے'' ۔(۱۰)

وقارؔ کے مرثیوں کی ایک جلد ''خورشید خاوری (۱۹۳۷ء)/جلد ریاض وقارؔ (۱۳۵۵ھ) کے تاریخی نام سے شائع ہوئی ۔جس پر میر علی محمد طالبؔ زید پوری نے دیباچہ لکھا اور یوسؔ زید پوری نے اشاعت کی تاریخ کہی:

جناب فضل علی با وقارؔ و عارف تھے
بجا ہے ایسے ہی بندوں کو با خدا کہنا
گل کلام میں خوشبو و رنگ انیسؔ کا ہے
صحیح ہے نہیں ہر گز غلط مرا کہنا
خدا کا فضل ہے مرحوم کا یہ حصہ ہے
ہر اک کا کام نہیں یوں زبان کا کہنا
کلام چھپ گیا ہے دیکھیں صاحبان نظر
بڑھے ہوئے کو ہے لازم بڑھا ہوا کہنا
ز روئے حسن یہ تاریخ لکھی یوسؔ نے
وقارؔ کے یہ مراثی ہیں ان کا کیا کہنا

(۸+۱۳۴۷=۱۳۵۵ھ)

فضل علی وقارؔ کی مرثیہ نگاری پر مفصل تبصرہ قمقام حسین جعفری نے اپنی کتاب ''شاگردان انیسؔ'' (۱۱) میں کیا ہے ۔ان کی مجلس چہلم میر نفیسؔ نے پڑھی ۔اس سلسلہ کی ایک رباعی ہے:

دردا کہ عجب یار موافق چھوٹا
صد حیف بڑا محبّ صادق چھوٹا
کیا حالت دل زباں پہ لاؤں میں نفیسؔ
کافی ہے کہ مجھ سے مرا عاشق چھوٹا

فضل علی وقارؔ کی لاش خان بہادر سید شرف علی (سب جج) نے کربلائے معلیٰ بھجوا دی۔ افسر امروہوی کے مطابق ماہنامہ الواعظ لکھنؤ کے مارچ ۱۹۳۹ء کے شمارے میں ان کے بارے میں ایک مضمون نکلا تھا۔ (۱۲) اس باکمال مرثیہ گو کی مرثیہ نگاری پر تبصرہ تفصیل کا متقاضی ہے۔ جسے کسی اور موقع پر پیش کیا جائے گا۔

انیسؔ کے دوسرے فیض یافتہ سید الہام حسین الہامؔ (م۔شعبان ۱۳۱۷ھ / دسمبر ۱۸۹۹ء) ہیں جن کی تاریخ وفات یوسؔ نے کہی۔

میر الہام حسین رحلت کرد (۱۳۱۷ھ)

اس تاریخ کے ساتھ نہ تو اشعار ملتے ہیں اور نہ ہی کوئی دوسری تاریخ۔ اس کے سر نامہ میں یوسؔ نے انہیں ''مصنف مثنوی باغ ارم و دیگر کتب فارسی و اردو'' لکھا ہے۔ ''باغ ارم'' فارسی مثنوی ہے جو مطبوعہ ہے لیکن راقم اس کی زیارت سے ابھی تک محروم ہے۔ بہر حال الہامؔ اردو و فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ ''تجلیات'' کے اندراج کے مطابق وہ ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۸ء میں جوان تھے۔ ان کی تصنیف سے دو تاریخیں حسینیہ ظل حسین زید پور میں آویزاں ہیں۔ عزیزؔ لکھنوی نے ''تجلیات'' میں چند شعر درج کئے ہیں جو انہوں نے مفتی محمد عباس شوستری کے سامنے اس وقت پیش کئے تھے جب انہوں نے ۱۸۵۷ء کی فتنہ سامانیوں کے ایام میں زید پور میں پناہ لی تھی۔ ان کا خوشخط اصلاحی مرثیہ انیسؔ و موسؔ کی نظر سے گزرا ہوا ذخیرۂ سید محمد رضا عابدؔ (جیالوجسٹ جیالوجیکل سروے آف انڈیا) مقیم مقبرہ

عالیہ گولہ گنج لکھنؤ کے پاس موجود ہے۔ اس کے سروق پر تحریر ہے۔

''از ملاحظہ میر ببر علی انیسؔ و میر نواب موسؔ گزشتہ''

غالباً اس مرثیہ پر انیسؔ کے مشورہ سے موسؔ نے یہ اصلاحیں کیں۔ مقطع میں ان کے تخلص الہامؔ کو بدل کر بدرؔ کر دیا گیا ہے۔

الہامؔ کی مرثیہ گوئی، ان کے عام حالات کی طرح پردۂ خفا میں ہیں۔ بہر حال وہ ایک رئیس باپ کے بیٹے تھے اور باکمال شاعر سید مہدی حسین عبرتؔ زید پوری شاگرد قتیلؔ لکھنوی کے بھتیجے تھے۔

بالواسطہ فیضان انیسؔ حاصل کرنے والوں میں آثرؔ اور زارؔ شاگردان نفیسؔ کے نام آتے ہیں۔ سید فرزند حسن آثرؔ زید پوری (م۔۱۳۲۰ھ/۱۳- ۱۹۱۲ء) حیدرآباد میں معزز عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے حیدرآباد میں عالی شان مکان کے علاوہ زید پور میں ایک شاندار مسجد اور عظیم الشان امامباڑہ تعمیر کرایا۔ ''شجرات طیبات'' آثرؔ کے ادبی کارناموں کے ذکر سے خالی ہے۔ ان کی ایک بیت مرحوم سید دلشاد حسین زید پوری (صدر الافاضل) سے سید محمد رضا عابدؔ زید پوری نے سنی تھی:

آخر گلے لگا کے شہ مشرقین کو خنجر لہو کے اشکوں سے رویا حسینؑ کو

اس بیت ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آثرؔ کوئی معمولی درجہ کے شاعر نہ تھے۔ زید پور کے بزرگوں کا بیان ہے کہ وہ بڑے صاحب سلوک، سخی اور باذل تھے۔ ۱۳۲۰ھ میں آثرؔ نے انتقال کیا۔ یوسؔ کی تاریخ سے ان کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

صد افسوس رحلت نمود از جہاں
آثرؔ عبد رب بندۂ پنجتن
بہ پرسند ہمدردیش اہل درد

سلوکش ز اغیار ہنوز ہموطن
بہر چار سو شہرہ در زید پور
بلند است آوازہ اش در دکن
رقم کرد یونسؔ پئے سال فوت
بنزد حسنؑ رفت فرزند حسن

(۱۳۲۰ھ)

نفیسؔ کے دوسرے شاگرد سید آغا علی زارؔ زید پوری (پ۲-۱۲۸۱ھ/۶-۱۸۶۵ء۔ وفات۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء) ہیں جن کو پتہ نہیں کس تسامح کی بنا پر افسرؔ امروہوی اور قمقام حسین جعفری نے انیسؔ کے شاگردوں میں شمار کیا جب کہ محولہ ''شجرات طیبات'' کی اصل عبارت یہ ہے:

''آپ مرثیہ گو، مرثیہ خواں ارشد تلامذہ میر نفیسؔ اعلی اللہ مقامہ ہیں۔ آپ کا کلام قابل قدر اور لائق تعریف ہے''۔(۱۳)

زارؔ حکیم بندہ احمد کے بیٹے اور سید محمد عسکری تعلقدار زید پور کے چھوٹے بھائی تھے۔ یونس نے قطعۂ تاریخ میں ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے:

مدح خواں معجز بیاں آغا علی مقبول رب
رفت از دار فنا در خدمت مولا علیؑ
مرثیہ گو پیر وطرز انیسؔ خوش بیاں
دردلش ہم برزبانش یا حسینؑ و یا علیؑ
سید عالی گہر زائر رئیس زید پور

بود در دنیا معین حامی است در عقبا علی
نظم ہم می کرد ہم در نثر می گفت این سخن
بعد اللہ و نبیؐ یکتا و بے ہمتا علیؑ
از پئے تاریخ مداح علیؑ یونسؔ نوشت
بود زیب بزم مداح علیؑ آغا علی

(۱۳۵۵ھ)

اس مختصر مقالے میں انیسؔ و نفیسؔ سے براہِ راست فیضان حاصل کرنے والے شعراء کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے جبکہ ان دونوں باکمالوں سے بالواسطہ استفادہ کرنے والے مداحان اہلبیتؑ کی ایک طویل فہرست ہے۔ شاید تحقیق و تنقید کی نگاہِ توجہ اس موضوع کی طرف مڑے اور رثائی ادب میں ان شعراء کو بھی جائز مقام ملے۔

○○○

حواشی:

(۱) بیسویں صدی اور جدید مرثیہ: ڈاکٹر ہلال نقوی: کراچی ۱۹۹۴ء: صفحہ ۹۴-۷
(۲) تجلیات: عزیز لکھنوی: نظامی پریس لکھنو: ۱۳۴۴ھ: صفحہ ۹۱-۹۰
(۳) محسن زید پوری اور ان کی مرثیہ گوئی: سید سبط محمد نقوی: سرفراز رجب نمبر: ۱۳۹۶ھ: صفحہ ۱۲۳
(۴) ایضاً
(۵) دبستان دبیر: ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی: لکھنؤ: ۱۹۶۶ء: صفحہ ۳۴۰
(۶) دانش صاحب نے وقار کو تلمیذ نفیس لکھا ہے جبکہ فروغ سیتا پوری نے 'شجرات طیبات' میں وقار کو شاگرد انیس ہی لکھا ہے۔ فروغ خود نفیس کے شاگرد تھے اگر وقار نفیس کے شاگرد ہوتے تو فروغ اس کا تذکرہ ضرور کرتے (عابد حیدری)
(۷) ادبی میراث: علی احمد دانش: نیشنل آفسیٹ پریس لکھنؤ: ۱۹۹۶: صفحہ ۲۱
(۸) شاہ جی کا امامباڑہ شاہی دور کی تعمیر ہے۔ میر انیس کا مذکورہ مصرع تاریخی نظم کا جزو ہوگا۔ اگر مادہ ہے تو تعمیہ (تدخلہ) یا زبر و بینہ ہوگا۔ (عابد حیدری)
(۹) ادبی میراث: صفحہ ۲۲
(۱۰) شجرات طیبات: سید ظہور الحسن فروغ سیتا پوری: امیر المطابع سیتا پور: ۱۹۱۶ء: صفحہ ۲۰۷
(۱۱) شاگردان انیس: قمقام حسین جعفری: مکتبہ جعفری کراچی: ۱۹۷۹ء: صفحہ ۱۸۶
(۱۲) فیضان انیس: افسر امروہوی: سہ ماہی اردو کراچی: انیس نمبر جلد ۴۶: ۳و۴: ۱۹۷۳ء: صفحہ ۲۷۰
(۱۳) شجرات طیبات: صفحہ ۲۸۳

انیسؔ اور شخصی مرثیہ

اصناف ادب میں مرثیہ کی قدامت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا، جتنی قدیم نسل انسانی کی تاریخ ہے اتنی ہی قدیم تاریخ مرثیہ بھی ہے اور یہ بات مسلم حیثیت رکھتی ہے کہ صنف مرثیہ کا آغاز ہی شخصی مرثیہ سے ہوا ہے۔ اس لئے کہ حضرت آدمؑ نے اپنے عزیز فرزند جناب ہابیل کے فراق میں جو کلمات رنج و غم اپنی زبان سے ادا کئے تھے اسے ادبی زبان میں مرثیہ ہی سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ حضرت آدمؑ کے تاثرات ہوں یا حضرت طالوت کی وفات پر حضرت داؤدؑ کا مرثیہ یا کرونچ پنک چھی (क्रौंचपंक्षीपाी) کے شکار ہونے پر بالمیکی کا اظہار رنج و غم، اپنی نوعیت و ماہیت کے اعتبار سے انہیں شخصی مرثیہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ شخصی مرثیہ کی قدامت کا ایک بہت بڑا ثبوت توریت میں مختلف انبیاء کے نوحوں کی موجودگی بھی ہے۔ اس کے علاوہ ابن ہشام نے خاندان رسالت کی بعض شخصیات کے مرثیے نقل کئے ہیں۔ بعد وفات رسولؐ خدا آپؐ کی پھوپھی حضرت صفیہ، حضرت ابوبکر، حضرت حسان بن ثابت اور امیر المومنین حضرت علیؑ کے مرثیے طبری میں موجود ہیں۔

مرثیہ چونکہ بلا تخصیص ہر انسان کے خالص فطری جذبات سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلئے اس صنف کو کسی ایک علاقے، زبان اور ماحول سے کبھی مخصوص نہیں کیا گیا ہے۔ دنیائے ادب کی یہی ایک ایسی منفرد صنف ہے جو دنیا کی ہر زبان و ادب، ہر علاقے اور ماحول میں بحیثیت موضوع یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

عربی ادب کی تاریخ کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں کوئی ایسا شاعر نہیں ملتا جس نے شخصی مرثیہ نہ کہا ہو۔علامہ شبلی نعمانی نے ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' میں لکھا ہے:

''اگر چہ جاہلیت ہی کے زمانے میں مرثیہ گوئی کو بہت ترقی ہو چکی تھی اور بہت سے شعراء نے بڑے بڑے پر اثر مرثیے لکھے تھے''(۱)

بہر حال عربی ادب میں مرثیہ ایک باوقار صنف ہے اور ادب الجاہلی میں مرثیوں کا خاص مقام ہے۔شدید محبت اور نفرت عرب مزاج کی خاصیت ہے۔اس لیے عربی کے متغزلانہ قصائد کی طرح عربی مرثیے بھی شدت جذبات و احساسات کے لئے ممتاز ہیں ۔علامہ شبلی نعمانی نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

''بہر حال عرب میں چونکہ شاعری کی ابتداء اظہار جذبات سے ہوئی تھی اس لئے سب سے پہلے شاعری کی ابتداء مرثیے سے ہوئی جو سب سے قوی تر جذبۂ اثر ہے''۔(۲)

بہر کیف مرثیہ گوئی انسان کے اعلیٰ شریفانہ جذبات کی مظہر ہے۔کسی مرنے والے کی خوبیوں کا اقرار، اس سے اپنی محبت اور وابستگی کا اظہار، اس کی دائمی جدائی پر اپنے اندوہ و الم کا بیان۔اس کے انتقال پر اپنے تاثرات قلب کا مظاہرہ اخلاق عالیہ کا جزو ہیں ۔یہ رحم، ہمدردی، محبت باہمی اور سچی انسانیت کا ایک بڑا ثبوت ہے۔مرثیہ گوئی نہ صرف یہ کہ ایک فطری صنف ادب ہے بلکہ اخلاق حسنہ کا ایک جزو اور اعلیٰ تر صفات بشری کا نمونہ بھی ہے۔

دنیا کے زیادہ تر ملکوں اور زبانوں میں رثائی ادب کی روایت ملتی ہے۔اس کا بیشتر

حصہ لوک ادب پر مشتمل تھا اور ضائع ہو گیا۔پھر بھی جو کچھ بچ رہا ہے اس سے تاریخی تسلسل کا پتہ چلتا اور ارتقائی عوامل کا سراغ ملتا ہے۔یوروپ میں ایلجی (Elegy) تھرے نوڈی (Threnody) وغیرہ رثائی اسالیب ہیں اور ان کی گونج یونان اور روم سے لے کر فرانس اور انگلستان تک سنائی دیتی رہی ہے۔

اسی طرح فارسی ادب میں بھی شخصی مرثیے کی تاریخ بہت قدیم ہے۔فردوسیؔ نے سہراب کا مرثیہ اس کی ماں کی زبانی لکھا۔فرخیؔ نے سلطان محمود کا مرثیہ لکھا۔یہ دونوں مرثیے مثنوی کی شکل میں موجود ہیں۔اس کے علاوہ حکیم سنائی، خواجہ عطارؔ، شیخ سعدیؔ، اور امیر خسرو کے شخصی مراثی بھی اہمیت کے حامل ہیں۔غرض کہ عربی و فارسی دونوں زبانوں کے ادب میں مرثیے کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔جہاں تک ہندوستانی ادب میں مرثیوں کا تعلق ہے۔علی جواد زیدی کا خیال ہے کہ:

''ہندوستانی ادب میں مرثیوں جیسی کوئی صنف نظر نہیں آتی، لیکن بھرت کے زمانے سے دردرس (d:.k) کو ایک مستقل جذبہ کے تحت تسلیم کیا گیا ہے اور ولاپ اور بین کی روایتیں عام طور سے ملتی اور رامائن تک موجود ہیں''۔(۳)

اردو میں اس صنف نے وسیع ادبی تناظر میں اپنا سفر طے کیا ہے۔شخصی مرثیوں کا نقطۂ آغاز اگر میرانجی یا جعفرؔ زٹلی سے مانا جائے تو اس صنف نے ایک طویل مسافت طے کی ہے۔میر تقی میرؔ نے اپنی اس بیٹی کا تذکرہ غزل کے ایک مطلع میں کیا ہے، جو شادی کے کچھ دنوں بعد انتقال کر گئی تھی۔یہ مطلع ایک پورے مرثیے کی حیثیت رکھتا ہے:

کھلا ہم پر یہ اے آرام جاں اس نا مرادی میں
کفن دینا تجھے بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

میرؔ کا یہ شعر ہو، غالبؔ کا مرثیۂ عارف، یا اپنی والدہ کی وفات پر اقبالؔ کا مرثیہ، یہ مرثیے شخصی مرثیہ کا وہ رخ ہیں جن کی خلش اور کسک میں ذاتی دکھ اور نجی تاثرات ہیں، لیکن ایک بڑی سطح پر ان شخصی مرثیوں کا تخلیقی پھیلاؤ زیادہ ہے، جو اکابر قوم وملت کے متعلق کہے گئے۔ اکابر قوم وملت کے مراثی لکھنے کی اہمیت پر سب سے پہلے حالیؔ نے ''مقدمۂ شعر و شاعری'' میں زور دیا:

> ''قوم میں قومیت کی روح اس طرح پھونکی جاسکتی ہے کہ قوم کے افراد مثل ایک خاندان کے ممبروں کے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کریں، زندگی میں ان کی نیکیوں کو چمکائیں، کمالات کو شہرت دیں اور مرنے کے بعد ان کی ایسی یادگاریں قائم کریں جو صفحۂ ہستی سے کبھی نہ مٹنے والی ہوں''۔(۴)

مولانا حالیؔ نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار اپنی ایک تقریر میں بھی کیا تھا۔ جب وہ حکیم محمود خاں کا مرثیہ پڑھنے کھڑے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

> ''قوم سے جب قوم کا کوئی محسن اور خدمت گزار گزر جائے تو اس کی زندگی کے حالات قلمبند کئے جائیں اور شعراء جو قوم کی زبان ہیں، تمام قوم کی طرف سے ان کے مرثیے لکھیں تا کہ معلوم ہو کہ قوم اپنے محسنوں کی قدر کرتی ہے''۔(۵)

حالیؔ نے اپنے ان مشوروں پر خود عمل کیا۔ انہوں نے واقعۂ کربلا یا حضرت امام حسینؑ پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا، بلکہ جتنے بھی مراثی کہے وہ شخصی نوعیت کے حامل ہیں۔

اردو کے شخصی مرثیوں کی تاریخ میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے ایک نیا باب کھولا،

ان شعراء نے ذاتی یا قومی غم کو واقعۂ کربلا سے ربط دے کر عظمت غم کی پائندگی کا احساس اجاگر کیا اور اس عظیم المیے کے پس منظر میں نجی یا اجتماعی غم کے تذکرے میں صبر واستقامت کا حوصلہ عطا کیا اور انہیں خصوصیات نے ان شخصی مراثی کو آفاقیت بخشی ہے۔

۱۸۴۴ء میں میر انیسؔ کے والد گرامی میر مستحسن خلیقؔ کا انتقال ہوا۔ ان کے انتقال پر بہت سے شعراء نے انہیں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ انیسؔ نے بھی اپنے کلام میں جا بجا ان کی وفات سے ہونے والی محرومیوں کا ذکر کیا ہے:

ہم مر گئے خلیقؔ کے مرنے سے اے انیسؔ
جینے کا لطف اٹھ گیا اس باخدا کے ساتھ

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

بس اے انیسؔ بس کہ دعا کا ہے یہ مقام
ہو مغفرت خلیقؔ کی یا ربِ ذوالکرام
مداح پاک آل نبیؐ تھا وہ خوش کلام
یارب اسی بزرگ کا یہ فیض ہے تمام

اس کے علاوہ انیسؔ نے اپنے مشہور مرثیے

نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری

میں میر خلیق کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

خلق میں مثل خلیقؔ اور تھا خوش گو کوئی کب
نام لے دھولے زباں کو کوثر و تسنیم سے جب
بلبل گلشن زہراؑ و علیؑ عاشق رب
متبع مرثیہ گوئی میں ہوئے جس کے سب

ہوا گر ذہن میں جودت ہے کہ موزونی ہے
اس احاطہ سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

اس بند کی بیت سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کسی میں جودت ذہنی اور موزونی طبع ہوتی بھی تھی تو انیسؔ اس کی فوقیت اور برتری تسلیم نہیں کرتے کیونکہ میر انیسؔ خوش گوئی میں خلیقؔ کو بے نظیر مانتے ہیں، زبان کو خلیقؔ کی زبان کہتے ہیں:

حق ہے کبھی سنا نہیں اس حسن کا بیاں ☆ حقا کہ یہ خلیقؔ کی ہے سر بہ سر زباں

انیسؔ نے خلیقؔ کے انتقال پر باقاعدہ شخصی مرثیہ تو نہیں کہا لیکن اپنے ایک مرثیے ع

بلبل ہوں بوستان شہ تاجدار کا

میں اپنے والد کے انتقال سے ہونے والے رنج وغم کی کیفیت کو بڑے دردناک انداز میں بیان کیا ہے۔ مداحِ اہلبیتؑ اپنے ذاتی کرب کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا اور اس اذیت ناک رنج کو بیان کیا جو خلیقؔ کے انتقال کے بعد ان کے دل پر گذری تھی۔ انیسؔ نے مرثیے کے تین بندوں میں سے پہلے بند میں خلیقؔ کی شفقت ومحبت کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ میں جو کچھ بھی ہوں انہیں کی تعلیم وتربیت کا نتیجہ ہوں۔ آخری دو بندوں میں خلیقؔ کے دنیا سے چلے جانے پر اظہار رنج وغم کیا گیا ہے:

ادنیٰ سے ان کے فیض نے اعلیٰ کیا مجھے
ذرّہ تھا گو پہ مہر کی بخشی ضیا مجھے
سائے نے ان کے دے دیا ظلّ ہما مجھے
صدقے سے ان کے مل گئی طبع رسا مجھے
فرزند میں خلیقؔ سے عالی ہمم کا ہوں
درِ یتیم میں اسی بحر کرم کا ہوں

اس بند کی بیت ہی سے رنج وغم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور یہ غم انگیز فضا آخر تک باقی رہتی ہے:

یارب یہ کیسی باغ جہاں میں ہوا چلی
لالے کی طرح داغ دل زار میں پھلی
آئی صدائے آہ جو چٹکی کوئی کلی
ہے خارِ رنج سے دل بلبل کو بے کلی
گل چینِ موت گل کو جو صرف خزاں کرے
کیا عندلیب زمزمہ پردازیاں کرے

آخری بند میں اس عظیم شاعر کے دنیا سے گزر جانے پر اظہار حزن وملال کیا گیا ہے کہ خلیقؔ جیسا باپ اس دنیا سے گذر گیا، اس لیے کہ باپ کی جدائی کے زخم کو بیٹا ہی محسوس کرسکتا ہے:

جو سرو راست قد تھے ہوئے خاک میں نہاں
کوکو کا شور قمریوں میں ہے یہاں وہاں
تیغ اجل گلوں پہ چلی آ گئی خزاں
اڑتی ہے خاک خار ہو اگلشن جہاں
افسوس ہے خلیقؔ سا مشفق پدر نہیں
اس رنج سے کسی کو کسی کی خبر نہیں

غالبؔ کے انتقال (۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) پر میر انیسؔ بہت زیادہ رنجیدہ ہوئے۔ انہوں نے باقاعدہ کسی مرثیے میں ان کی (غالبؔ) وفات کا حال تو نظم نہ کیا البتہ دو رباعیاں ضرور کہیں:

گلزار جہاں سے باغ جنت میں گئے
مرحوم ہوئے جوار رحمت میں گئے
مداحِ علیؑ کا مرتبہ اعلیٰ ہے
غالبؔ اسد اللہ کی خدمت میں گئے

حاصل سفر خلد کے آثار ہوئے
رنج و غم و آلام سبھی خواب ہوئے
تھے ساقیٔ کوثر کے ثنا خواں غالبؔ
کوثر پہ قدم رکھتے ہی سیراب ہوئے

اس کے علاوہ انیسؔ نے ایک شخصی مرثیہ جس کا مطلع ہے:

یا خدا دل کو کسی کے غم اولاد نہ ہو

پٹنہ کے ایک رئیس نواب سید احمد حسین عرف احمد نواب کی مرگ ناگہانی سے متاثر ہوکر کہا ہے۔ جسے مہذبؔ لکھنوی نے ''وقار انیسؔ'' جلد دوم میں شائع کیا ہے۔ مہذبؔ لکھنوی اس مرثیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس غیر مطبوعہ مرثیے کی تاریخ یہ ہے کہ جوانا مرگ نواب سید احمد حسین صاحب مرحوم نے جن کی عمر ۱۶ سال کی تھی تپ محرقہ اور چیچک میں مبتلا ہو کے جہاں بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کے دنیائے فانی سے کوچ کیا تھا وہاں زوجہ اور کمسن بچہ بھی چھوڑا تھا۔ باپ نے جوان فرزند کے مرنے پر جہاں انتہائی غم کیا وہاں انتہائی شان سے رسوم غم بھی ادا کئے۔ حضرت انیسؔ کو لکھنؤ سے بلا کر مجلس چہلم پڑھوائی''۔(۸)

مہذبؔ لکھنوی نے نواب سید وارث اسمٰعیل (جن کے پاس یہ مرثیہ محفوظ تھا) کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے:

''یہ وہ مرثیہ ہے کہ جو حضرت انیسؔ نے میرے جد اعلیٰ کی مجلس چہلم میں نظم فرما کر پڑھا تھا''۔

اس مرثیے کے بارے میں سید محمد ہادی لائقؔ خلف عارفؔ لکھنوی نے میر انیسؔ کا کلام ہونے پر شبہ کا اظہار کیا ہے۔ سید علی احمد دانشؔ کے پاس ''وقار انیسؔ'' جلد دوم کا جو نسخہ موجود ہے اس پر سید محمد ہادی لائقؔ نے درج ذیل سوالات اٹھائے ہیں:

''جناب صدر انجمن محافظ اردو نے یہ مرثیہ میر انیسؔ مرحوم کے نام سے طبع فرمایا ہے۔ اس مرثیہ میں مقطع نہیں ہے۔ اگر مقطع تھا تو کیوں نہیں لکھا گیا۔ اگر مقطع نہیں ہے تو کیا دلیل ہے کہ یہ مرثیہ میرؔ صاحب مرحوم کا ہے''؟

سید محمد ہادی لائقؔ مزید لکھتے ہیں:

''کوئی بھی یہ بات سمجھ لے گا کہ یہ کلام میرؔ صاحب کے کلام سے مناسبت نہیں رکھتا ہے اور نہ اس پایہ کا مرثیہ ہے کہ میر انیسؔ مرحوم کے کمال میں کوئی اضافہ کرے، ہم لوگوں میں یہ بات مثل ایمان کے مانی جاتی ہے کہ میرؔ صاحب علاوہ اہلبیتؑ یا شہدائے اسلام کے اور کسی کا مرثیہ نہین لکھتے تھے اور نہ کسی اور کی مدح کرتے تھے۔ خود لکھنؤ میں ایسے ایسے جانکاہ واقعات گزرے ہیں، میر صاحب کے زمانے میں غدر ہوا۔ اپنی قومی سلطنت تباہ ہوئی، بڑے بڑے امراء تباہ

ہوئے ۔کئی شہزادے گولی کا نشانہ ہوئے، بہت سے لوگ
نہایت مظلومی کے ساتھ قتل کئے گئے،لیکن میرؔ صاحب نے
ایک مصرعہ بھی کسی کی وفات یا غم میں نہیں کہا۔تعجب کی بات
ہے کہ وہ احمد نواب صاحب مرحوم کے انتقال سے اتنا متاثر
ہوئے کہ ایک پورا مرثیہ نظم فرمایا''۔

سید محمد ہادی لائقؔ نے یہ بھی لکھا ہے:

''ہوسکتا ہے کہ اصل مرثیہ میں کوئی ایسی سند ہو جس سے
ثابت ہوتا ہو کہ یہ میرؔ صاحب کا مرثیہ ہے لیکن مہذبؔ
صاحب کو ایسی سند مطالعین کے سامنے پیش کرنی چاہیئے تھی
تا کہ وہ خود اپنی رائے قائم کر سکتے کہ آیا یہ میرؔ صاحب کا
مرثیہ ہے یا نہیں''۔

بہرحال ''وقار انیسؔ'' جلد دوم کے سرورق پر تحریر ہے:

''یہ مرثیہ حضرت انیسؔ نے پٹنہ کے ایک رئیس کی مجلس چہلم
کے لئے ۱۸۵۸ء میں نظم فرمایا تھا''۔

استادی پروفیسر نیر مسعود نے اپنی کتاب ''انیس'' میں نواب سید وارث اسمٰعیل کے ایک خط کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ یہ مجلس اپریل ۱۸۵۸ء میں (۱۶ شعبان اور ۲۵ شعبان ۱۲۷۴ھ کے درمیان) ہوئی تھی۔ پروفیسر نیر مسعود نے اس مرثیے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اپریل ۱۸۵۸ء کا زمانہ لکھنؤ میں سخت افراتفری کا تھا۔
۲۱/ مارچ تک یہاں قتل عام ہوتا رہا، پھر امن کی منادی

ہوئی اور شہر کا تخلیہ کر جانے والوں کو اپریل کے اندر اندر
واپس آ جانے کی مہلت دی گئی۔انیسؔ کی لکھنؤ واپسی کا یہی
زمانہ تھا۔اسی زمانے اور اپریل کے مہینے میں ان کا عظیم آباد
کی ایک مجلس میں خواندگی طے کرنا،مجلس کے لئے نیا مرثیہ
کہنا اور طویل سفر کر کے مجلس پڑھنا بعید از قیاس تو معلوم
ہوتا ہے لیکن خارج از امکان نہیں کہا جا سکتا۔''(۹)

مرثیے میں کل ۵۱ بند ہیں جو مسدس کی ہیئت میں ہیں۔اس کے چہرے میں جوانا مرگ نواب سید احمد حسین کی مناسبت سے اولاد کے گذر جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔جوان اولاد کے غم میں جو احساسات و کیفیات قلبی ہوتی ہے اور جو کچھ ایک عام انسان کے دل پر گذرتی ہے اس کو بڑی حساس نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ساتویں بند سے نواب احمد حسین کی بیماری اور اس بیماری سے ہونے والی اذیت کا بیان ہے۔اس عالم میں اعزا و اقربا کو نواب احمد حسین کی زبانی اہلبیتؑ کے غم انگیز واقعات سنا کر تسلی و تشفی دینا مرثیے کی عزائی فضا میں اضافہ کرتا ہے۔آخر کے آٹھ بندوں میں حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کا بیان ہے۔مرثیے کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

یاخدا دل کو کسی کے غم اولاد نہ ہو
مبتلا داغ پسر میں کوئی نا شاد نہ ہو
یہ ریاضت کسی دشمن کی بھی برباد نہ ہو
اور سب دکھ ہوں جہاں میں پہ یہ بیداد نہ ہو
دل اسی کو فت میں نالوں کی صدا دیتا ہے
یہ وہ غم ہے جو کلیجہ کو بٹھا دیتا ہے

کسی انساں کو نہ یہ داغ دکھائے اللہ
یہ وہ دکھ ہے کہ جہاں ہوتا ہے آنکھوں میں سیاہ
یہ ہے وہ درد کہ سب مانگتے ہیں جس سے پناہ
یہ وہ ماتم ہے کہ ہو جاتا ہے گھر جس سے تباہ
یہ وہ صدمہ ہے کہ دشوار ہے جینا جس سے
یہ وہ آتش ہے کہ جل جاتا ہے سینہ جس سے

اس کے بعد شاعر والدین کی اس کیفیت کو بیان کرتا ہے جب کہ جوان بیٹا جو پورے خانوادے کی امیدوں کا مرکز تھا وہ دنیا سے گذر جاتا ہے تو اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ پورا گھر عزاخانہ بن گیا ہو۔ گویا اب دنیا رہنے کی جگہ نہیں ہے، کیونکہ جوان بیٹے کے دنیا سے چلے جانے سے ضعیف باپ کی بصارت زائل ہوگئی، ماں ان تمام جگہوں اور چیزوں کو دیکھ دیکھ کر بین کرتی ہے جس کا تعلق متوفی سے تھا۔ شاعر اگلے بند میں متوفی کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

حیف ہے تازہ جواں تھے ابھی احمد نواب
کچھ اٹھایا بھی نہ تھا لطف گلستان شباب
دے دیا زیست نے ایام بہاری میں جواب
بحر ہستی میں فنا ہو گئے مانند حباب
کیوں نہ جانکاہ ہو اس جان جہاں کا مرنا
ماتم سخت ہے دنیا میں جواں کا مرنا

اس بند کی بیت اس قدر بے ساختہ ہے کہ دل داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگلے بند میں اس اذیت ناک منظر کو پیش کیا گیا ہے جب مریض کی تکلیف اور اذیت کو دیکھ کر

متعلقین اپنے اپنے طریقے سے اس مصیبت میں تسلی و تشفی کے اسباب مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی طبیب لاتا ہے کوئی نسخہ لے کر عطار کے پاس جاتا ہے، کوئی صدقے اتارتا ہے، کوئی دعائیں پڑھ کر دم کرتا ہے اور کوئی کربلاؤں، درگاہوں اور زیارت گاہوں پر جا کر شفا کے لئے منت مانتا ہے لیکن ان سب تدابیر کے بعد بھی جب کسی طرح کا افاقہ نہیں ہوتا تو عزیزوں، خاص کر ماں کی کیا حالت ہوتی ہے:

غم سے تھا سارے عزیزوں میں تلاطم برپا
کہیں آہوں کی صدا تھی کہیں رونے کی صدا
سب پہ روشن تھا کہ مر جائے گا یہ ماہ لقا
ماں یہ بیتابی میں سر کھول کے کرتی تھی دعا
مدد حیدرؑ و زہراؑ و محمدؐ ہو جائے
یا الٰہی مرے بچے کی بلا رد ہو جائے

اس بند میں ماں کی دعا میں ممتا کی فطری التجا اور گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس مخصوص ماحول اور معاشرے کی رسومات، نفسیات اور زبان و بیان کا بھرپور اہتمام کیا گیا ہے جو میر انیسؔ سے مخصوص ہے۔ اس عالم اضطراب میں بھی نواب احمد حسین نے صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اللہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنے اور صبر کی وصیت کرتے ہیں۔ ماں سامنے کھڑی ہے اور دنیا سے جلد رخصت ہونے والا دل کا ٹکڑا ماں سے کہتا ہے:

آپ کیوں روتی ہیں جو مرضیٔ ربِ اکبر
آگے ماں باپ کے مرتا نہیں کیا کوئی پسر
کارخانہ یہی جاری ہے یہاں شام و سحر
کوئی آتا ہے جہاں میں کوئی کرتا ہے سفر

شکر معبود کا ہر حال میں دم بھرتے ہیں
پیر ناچاری سے جیتے ہیں جواں مرتے ہیں

اس بند کی چستی ،اس کی خوبی بندش تو قابل دید ہے ہی ، ساتھ ہی ساتھ فلسفۂ موت و حیات اور دنیا کی بے ثباتی پر بہت ہی خوبصورت تبصرہ بھی ہے۔ اگلے بند میں متوفی جہاں ایک طرف اپنی والدہ سے صبر کی تلقین کرتا ہے، وہیں یہ بھی کہتا ہے کہ آپ کا صبر کرنا اس لئے بجا ہے کہ اے مادر گرامی آپ نے اپنی تمام حسرتیں پوری کر لیں ، اب میں آپ کو اس بات کی وصیت کرتا ہوں کہ جب میرا نور نظر جوان ہو اور آپ اسے بیاہیں تو دولہا دلہن کو میری قبر پر ضرور لے آئیں۔
اس کے بعد شاعر شہیدان کربلا کے حوالے سے نواب احمد حسین کی زبانی ماں کو تسلی و دلاسہ دیتا ہے:

آپ تو عاشق اولاد پیمبرؐ ہیں کمال
ذکر سنتی ہیں جوانان علیؑ کا ہر سال
شہر بانو کی مصیبت کا مناسب ہے خیال
مر گیا ہو کے جواں اکبرؑ ذی جاہ سا لال
ہم تو بیاہے بھی گئے صاحب اولاد ہوئے
وہ تو بن پھولے پھلے کشتۂ بیداد ہوئے

یہاں سے شاعر نے مرثیے کا رخ کربلا کی طرف موڑا ہے اور نواب احمد حسین کی جوانا مرگی کی مناسبت سے مرثیے کو شہزادۂ علی اکبرؑ سے مخصوص کیا ہے۔ شہزادۂ علی اکبر کے حوالے سے اپنی والدہ کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے مامتا کی علامت کے طور پر حضرت شہر بانو کا تذکرہ کیا ہے جو کہ خلاف واقعہ ہے جب کہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی اکبر کے حوالے سے حضرت ام لیلیٰ کا ذکر ہونا چاہیئے تھا دوسری تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ جناب شہر بانو کربلا میں موجود نہیں تھیں اور یہ ذاکرین کی اختراع ہے۔

حضرت شہر بانو امام زین العابدینؑ کی والدہ کا اسم گرامی ہے۔ اس بند سے سید محمد ہادی لائقؔ کے اس شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ یہ مرثیہ میر انیسؔ کا نہیں ہے۔
اگلے بند میں شاعر نے اس منظر کو پیش کیا ہے جب جنازے کو لوگ گھر کے باہر لے جاتے ہیں اس وقت ماں کے تاثرات قابل دید ہیں:

ہائے پیارا مرا ہے ہے مرا احمد نواب
چھپ گیا آنکھوں سے افسوس یہ رشک مہتاب
آیا لوگوں مرے یوسف کو عجب طرح کا خواب
رو کے چلاتی ہوں میں کچھ نہیں دیتے یہ جواب
ایسے بے بس ہیں کہ آتے ہیں نہ سمجھاتے ہیں
کیسے تابوت میں خاموش چلے جاتے ہیں

اس بند کی بیت میں ایک جوان بیٹے کے لئے گریہ کرنے والی ماں کے بین کا گہرا اور شدید تاثر موجود ہے، ساتھ ہی ساتھ زبان کی روانی اور سلاست قابل غور ہے۔
انیسؔ نے اس مرثیے میں جہاں والدین کے جذبات کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے وہیں جوان بیوہ کے جذبات کو بھی بڑے سلیقے سے نظم کیا ہے:

موت نے لوٹ لیا راج ہمارا صاحب
زیست تم بن گئے کیونکر ہو گوارا صاحب
بے پدر ہو گیا یہ راج دلارا صاحب
ہم سے کیا سب سے کیا تم نے کنارا صاحب
کیا خبر ہے کسے راحت کسے آرام نہیں
ہجر میں روئے کہ پیٹے کوئی کچھ کام نہیں

زن وشوہر میں جو قربت اور وابستگی ہوتی ہے اس کی مناسبت سے اس بند میں بیوہ کے بین کے والہانہ پن نے ایک اصلی فضا پیدا کر دی ہے۔

آخر کے آٹھ بندوں میں انیسؔ نے شہادت علی اکبر کو نظم کیا ہے۔ جواں سال نواب احمد حسین کی جوانا مرگی کی مناسبت سے متوفی کے اہل خاندان کے لئے تسلی و تشفی اسی طرح ممکن تھی۔ انیسؔ نے ذکر شہادت اس طرح کیا ہے:

اب سنیں اہل عزا حالِ امام دو جہاں
رن میں جب چل گئی اکبر کے کلیجے پہ سناں
خوں یہ ابلا کہ بدن میں نہ رہی تاب و تواں
گر کے گھوڑے سے تڑپنے لگا وہ تشنہ دہاں
غل ہوا لخت دل سبط نبیؐ کو مارا
ہم نے ہم شکل رسولؐ عربی کو مارا

یہاں پر یہ بند بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ ایک طرح سے شہادت کے یہ بند پورے مرثیے کی جان ہیں۔ ان میں میر انیسؔ نے جس الم انگیز لمحے کو اپنی گرفت میں لیا ہے وہ لمحہ اس مرثیے کی روح ہے اور اس منظر نامے کی تشکیل میں انیسؔ نے اپنی کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان کا صحیح اور بجا استعمال کیا ہے اور یہ انیسؔ کا خاصہ ہے کہ انہوں نے کرداروں کی زبان سے ادا ہونے والے فقروں کو ان کرداروں کی نفسیات سے کبھی الگ نہیں ہونے دیا۔ دنیا کی فصیح ترین قوم عرب ان میں فصیح ترین قبیلہ قریش، قریش کا سب سے فصیح گھرانا بنو ہاشم اور بنو ہاشم کی فصاحت میں حضورؐ کا پیغمبرانہ لہجہ، حضرت ابوطالبؑ کا شعری وجدان اور امیر المومنین حضرت علیؑ کی بلاغت شامل ہو جائے تو اس المناک لہجہ میں کسی فرد کی زبان سے ادا ہو جانے والے بین یا گریہ کے الفاظ اسی قبیل کے ہونے چاہیے:

ہو گیا آنکھوں میں اندھیر کہ خورشید نہیں اب ہمیں لاش کے ملنے کی بھی امید نہیں
کچھ مری آنکھوں سے آتا نہیں اس وقت نظر
اپنے اس یوسف گم گشتہ کو ڈھونڈوں میں کدھر
بھانجا ہے نہ بھتیجا نہ برادر نہ پسر
کون لاوے مجھے اس گیسوؤں والے کی خبر
مضطرب فوج کے بادل کی طرف جاتا ہوں
گرتا پڑتا ہوا جنگل کی طرف جاتا ہوں

ان آٹھ بندوں میں غم و یاس کی جو فضا انیسؔ نے تخلیق کی ہے اس کی اثر انگیزی اپنی جگہ مسلم ہے۔ ساتھ ہی منظر نگاری اتنی موثر ہے کہ قاری چند لمحوں کے لئے خود کو اسی منظر میں کھڑا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ انیسؔ نے اپنے شخصی مرثیوں میں جن جن افراد و اشخاص کو موضوع بنایا ہے ان کی کرداری صفتوں، ذہنی کیفیتوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو صورت حال کے مطالبوں اور تقاضوں کے عین مطابق پیش کیا ہے اور اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے یا سننے والا ان اشخاص و افراد کے شخصی کردار سے مکمل واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ یہی انیسؔ کی کامیابی ہے۔

○○○

حواشی:

(۱) موازنہ انیسؔ و دبیرؔ: شبلی نعمانی: اتر پردیش اردو اکادمی: لکھنؤ: ۱۹۹۲: ص ۲
(۲) ایضاً: ص ۱
(۳) دہلوی مرثیہ گو: علی جواد زیدی: نفیس اکیڈمی: کراچی (پاکستان) ۱۹۸۸ء ص ۱
(۴) مقدمہ شعر و شاعری: حالی: مرتبہ وحید قریشی: ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ: ۱۹۹۳: ص ۲۳۸۔۲۳۷
(۵) مقالات حالی (حصہ دوم) حالی: انجمن ترقی اردو دہلی طبع اول: ۱۹۳۶ء: ص ۳۶
(۶) مرثیہ طغرئی نویس کن فیکوں ذوالجلال ہے۔ میں مرزا دبیرؔ نے علماء کا تذکرہ کر کے اسے ایک وسیع سطح پر اجاگر کیا (عابد حیدری)
(۷) میر انیسؔ، نادر معلومات: سید علی احمد داشؔ: مشمولہ ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۹۰ء: ص ۱۵
(۸) وقار انیسؔ (جلد دوم) مرتبہ مہذب لکھنوی: سرفراز قومی پریس لکھنؤ: ۱۹۵۴ء: ص ۹
(۹) انیسؔ (سوانح) ڈاکٹر نیر مسعود: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان: نئی دہلی: ۲۰۰۲ء: ص ۲۹۲

روہیل کھنڈ کی شاعرات اور رثائی ادب

علاقہ روہیل کھنڈ عبارت ہے اپنی تہذیب و ثقافتی اور علمی و ادبی روایات سے۔ روہیل کھنڈ شہیدوں، غازیوں، قلندروں اور علماء و ادبا کی سرزمین ہے۔ یہاں کے شاعروں، ادیبوں، مورخوں اور محققوں نے نہ صرف علاقہ روہیل کھنڈ بلکہ عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کی ہے۔ یہ علاقہ زمانۂ قدیم سے علماء، شہدا، مصنفین، شعراء اور صوفیائے کرام و اولیائے عظام کی پسندیدہ سرزمین رہی ہے۔ ہر دور میں یگانۂ روزگار ہستیوں اور گونا گوں خوبیوں سے متصف شخصیتوں کا اژدہام اس علاقے کا خاصہ اور اس کی شناخت رہا۔ تہذیب و تمدن، زبان و ادب اور علم و فضل کے کتنے ہی چراغ اس علاقہ کی تیرہ فضاؤں میں منارۂ نور بن کر چمک رہے ہیں۔ آج بھی تاریخِ ادب کے صفحات سے ان چراغوں کی ضیا پاش کرنوں کی چمک ہویدا ہے۔ علاقۂ روہیل کھنڈ کی صدیوں کی علمی و ادبی تاریخ گواہ ہے کہ یہاں شعر و سخن کا ہر دور میں چرچا رہا اور رام پور، بدایوں، سنبھل، امروہہ، بریلی، شاہ جہاں پور، مراد آباد اور بجنور کے اہلِ قلم نے شاعری کے ساتھ ساتھ فکشن، انشا پردازی اور تحقیق و تنقید میں اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے۔ روہیل کھنڈ کی شعریات کے مطالعہ سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ یہاں کی سرزمین پر شعرا کے ساتھ ساتھ شاعرات نے بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں اور اردو شعریات میں اضافہ کا سبب بنی ہیں۔

علاقہ روہیل کھنڈ میں جملہ اصناف سخن کے ساتھ ساتھ رثائی ادب کی تاریخ بھی

اپنے دامن میں قدامت لئے ہوئے ہے۔ میرؔ کے ہم عصر میر سعادتؔ اور مصحفیؔ کے دور سے یہاں رثائی ادب کے نقوش ملتے ہیں اور علاقہ روہیل کھنڈ کے رثائی نوادرات کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کی جاسکتی۔ رثائی ادب کے فروغ میں جہاں شعرائے کرام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہیں یہاں کی شاعرات بھی صنف قوی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ذیل میں روہیل کھنڈ کی چند شاعرات کے رثائی ادب کا مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے تاکہ رثائی ادب کی شعریات میں روہیل کھنڈ کی شاعرات کی خدمات کا تعین کیا جاسکے۔

○ **عصمتؔ**: نواب رفعت زمانی بیگم۔ نواب رضا علی خاں والی رامپور کی بیگم نواب رفعت زمانی بے حد خوش اخلاق، سخن فہم اور ذہین خاتون تھیں۔ کاملؔ لکھنوی سے اصلاح لیتی تھیں۔ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کے بقول ایک اچھی شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت عمدہ شعر پڑھتی تھیں۔ ''رامپور کا دبستان شاعری'' میں ان کی غزلوں کے نمونے موجود ہیں۔ غزلوں کے علاوہ نوحے اور سلام بھی کہتی تھیں۔ ۱۹۸۷ء میں رامپور میں وفات پائی۔

○ **شبنمؔ**: بیگم کشور آرا۔ رامپور میں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۶۲ء میں شوہر مولوی سلامت اللہ خاں ایڈووکیٹ وسابق چیئر مین میونسپل بورڈ رامپور کے اچانک انتقال کے بعد کانگریس نے اسمبلی الیکشن میں شوہر کی جگہ ان کو ٹکٹ دے دیا اور بھاری اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئیں۔ پیشے سے وکیل ہیں اور خیالؔ رامپوری سے تلمذ ہے۔ غزلوں میں کہیں کہیں پروینؔ شاکر کی ہمنوا معلوم ہوتی ہیں۔ نعت ومنقبت اور سلام میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ غزلوں میں بھی جگہ جگہ علامات کربلا موجود ہے:

تشنگی کا عجیب عالم ہے — آنکھ بھی اب تو نم نہیں ہوتی
خون آلود داستاں شبنمؔ — اب سپرد قلم نہیں ہوتی

○ **راحتؔ**: اشرف النساء رامپوری۔ خرموں والی زیارت پر امیر حسن خوشنویس کی

صاحب زادی تھیں۔ مشہور ادیبہ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کی نانی کی بڑی بہن تھیں۔ نواب رفعت زمانی بیگم کے امام باڑے میں اکثر و بیشتر سوز خوانی کیا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کے بقول نوحے اور سلام کہتی تھیں۔

○ **مدینہؔ**: سیدہ مدینہ خاتون۔ شمیمؔ امروہوی کی دختر تھیں۔ سیدہ مدینہ کو اردو کے علاوہ فارسی زبان پر بھی دسترس تھی۔ نوحے اور سلام کے علاوہ مرثیے بھی کہے ہیں۔ مرثیہ کہنے کا انداز کلاسیکی تھا۔ ان کے مراثی میں بین کا لہجہ بھی کلاسیکی مگر دردانگیز تھا:

حسین کہتے تھے اے میرے لال شکل دکھا — کہاں پہ لے گیا اپنی برات اے بیٹا
کدھر ہے اے مرے کڑیل جواں میں تجھ پہ فدا — کہاں ہے اے علی اکبر مجھے بھی پاس بلا

یہ کیا خبر تھی مقدر یہ دن دکھائے گا
شباب موت کا پیغام بن کے آئے گا

(اردو مرثیے کا سفر اور بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار: سید عاشور کاظمی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی: ۲۰۰۶ء: ص ۲۸۔۱۱۲۷)

○ **عسکریؔ**: عسکری خاتون۔ وطن امروہہ ایک مجموعہ سفینۂ نجات ۱۹۸۱ء میں پاکستان سے شائع ہوا۔ ایک مرثیہ عظیم امروہوی نے نقل کیا ہے۔ جس میں بین کا انداز مختلف ہے:

جس کو کاندھے پر چڑھاتے تھے نبیؐ تو قیر سے
پرورش پائی تھی جس نے فاطمہؑ کے شیر سے
اس کے ہاتھوں پر چھدا حلقوم اصغر تیر سے
کیا کہا دل نے کوئی پوچھے ذرا شبیر سے
کربلا میں زخم کھائے بھوکا پیاسا ہائے ہائے
زیرِ خنجر ہو پیمبرؐ کا نواسا ہائے ہائے

(اردو مرثیے کا سفر: سید عاشور کاظمی ص ۲۹۔۱۱۲۸)

○ **سلطانہ ذاکر آدا:** نام مصطفیٰ سلطانہ تخلص آدا، جائے ولادت رامپور والد کا نام خورشید علی مرزا قمی کاظمی۔ان کے شوہر سید ذاکر حسین نقوی نواب رامپور کی فوج میں افسر تھے۔قیام پاکستان کے بعد پاکستان آ گئے اور ذاکر صاحب پاک فوج میں اسی عہدے پر تعینات ہو گئے۔نمود سحر (غزل ومنظومات) ۱۹۹۹ء اور معراج وفا (حمد،نعت،منقبت،سلام ،مرثیہ) ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔عاشور کاظمی نے اردو مرثیے کا سفر میں ان کے دو مرثیوں۔ع

وارد جو کربلا میں شہہ کربلا ہوئے

اور

عباس مشک لینے گئے جب خیام میں

کا ذکر کیا ہے۔بطور مثال ایک بند پیش کیا جا رہا ہے:

یہ وہ جگہ ہے جس کو بتاتے تھے نانا جاں
یہ وہ جگہ ہے کھائیں گے اکبر جہاں سناں
ہاتھوں پہ تیر کھائے گا اصغر سا بے زباں
پیاسوں کے سر کٹیں گے لٹیں گے حرم یہاں
اک با وفا کے ہاتھ قلم ہوں گے اس جگہ
سجاد بھی اسیر ستم ہوں گے اس جگہ

○ **رقیہ سرسوی:** رقیہ بیگم نام۔''نہج البکا'' نامی سلاموں اور نوحوں کا مجموعہ ۱۹۵۳ء میں کانپور سے شائع ہوا۔درج ذیل مجموعہ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی سنبھلی کے پاس محفوظ ہے۔نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

اے سلامی مومنوں کے دیں کا رہبر کون ہے
جس نے اک پل میں اکھاڑا بابِ خیبر کون ہے

کون کرتا تھا ہٹیں طفلی میں حق سے مومنو
ما سوا شبیر کے معشوق داور کون ہے
دی صدا شیرانہ دریا پر علیؑ کے شیر نے
دیکھ لیں گے لڑنے آئے ہم سے ہمسر کون ہے
خوب مدح کی رقیہ حیدر کرار کی
صدق دل سے کہہ دو سب ایماں کا مصدر کون ہے

روداد کربلا کی سنائی نہ جائے گی
روز دہم کی یاد بھلائی نہ جائے گی
مل مل کے ہاتھ کہتی تھی زینبؑ حسینؑ سے
الفت تمہاری بھائی بھلائی نہ جائے گی
شہہ بولے کربلا ترے مہمان بس کہاں
کیا مرقدوں کی جا بھی بنائی نہ جائے گی
آسان دم نزع رقیہ پہ یا امام
یہ عرض تو یقیں ہے بھلائی نہ جائے گی

سلاموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رقیہ قادر الکلام شاعرہ تھیں۔لفظوں کا انتخاب اور اسلوب بیان انہیں ہم عصر شاعرات میں انفرادیت عطا کرتا ہے۔

○ **ملکہ سرسوی:** سرسی کی دوسری اہم شاعرہ ملکہ خاتون بنت مولانا متقی حسن متقی سرسوی استاد حضرت معجز سنبھلی ہیں۔جن کا ذکر شاعر اہل بیت جناب ثامن سرسوی نے راقم الحروف سے کیا۔موصوف کے مطابق ملکہ کا کلام دالان سرسی میں ان کی پوتی کے پاس موجود

ہے۔نوحے اور سلام کے علاوہ غالباً ایک مرثیہ بھی کہا ہے۔سلام کے چند شعر حاضر خدمت ہیں:

ہندوستاں میں اپنا سہارا نہیں کوئی
تو کربلا کے چھوٹے سے لشکر کو بھیج دے
نیزہ جگر پہ کھا کے جو میداں میں مر گیا
اسلام کے لئے علی اکبر کو بھیج دے
بھوکے پیاسے لاکھوں سے لڑ بھڑ کے مر گئے
عون و محمد و علی اکبر کو بھیج دے
شانے کٹا کے نہر پہ پیاسا جو رہ گیا
مظلوم کربلا کے برادر کو بھیج دے
خطرے میں ہر جگہ پہ ضرورت مدد کی ہے
سلمانؓ اور بو ذرؓ وقنبرؓ کو بھیج دے

○ **عشرتؔ بتول:** مشہور شاعر جناب انقلابؔ سرسوی کی صاحب زادی عشرتؔ بتول جدید لب و لہجے کی شاعرہ ہیں۔شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری اور ذاکری بھی ان کا شوق ہے۔انگریزی اور اردو ادب کا خاصہ مطالعہ ہے اور ان کے تجزیاتی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔غزل اور نظم کے علاوہ نعت،منقبت،نوحے اور سلام کہتی ہیں۔بطور مثال ایک سلام کے چند شعر حاضر خدمت ہیں:

بولے جبریلؑ کچھ مدد کر دوں
میں بھی فرش عزا بچھانے میں
کہہ دو خوشیوں سے انتظار کریں
میں ہوں مصروف غم منانے میں

حر سے ہیرے تراشے جاتے ہیں
عشق سرور کے کارخانے میں
دولت علم ہو عطا مولا
کیا کمی ہے ترے خزانے میں
نظم جذبات تو بھی کر عشرتؔ
رسم ہے یہ ترے گھرانے میں

○ **زینتؔ شادانی:** سنبھل کی اہم شاعرہ زینتؔ شادانی ہیں۔جو استاد شاعر حضرت شفقؔ شادانی کی بیٹی اور مشاعرے اور محفلوں کے مقبول شاعر پیکرؔ سنبھلی کی شریکِ حیات ہیں۔ والد کے زیر تربیت بچپن ہی سے شعر گوئی کو اپنا شعار بنایا اور شادی کے بعد گھر کے شاعرانہ ماحول نے شاعری میں چار چاند لگایا۔ان کے متعدد نوحے اور سلام رسائل کی زینت بنے اور کئی بار آل انڈیا ریڈیو رامپور سے اپنا کلام پیش کیا۔زینتؔ خاتون خانہ ہونے کے باوجود رثائی ادب کے فروغ میں ہمیشہ مصروف رہتی ہیں اور یکے بعد دیگرے اپنے کلام محافل ومجالس میں پیش کرتی رہتی ہیں۔زینتؔ نے اپنی شعریات کو اسلامی تاریخ اور واقعات کربلا تک محدود رکھا ہے۔اس لئے کہ وہ اس عظیم قربانی کو تمام انسانیت کے لئے نمونۂ عمل قرار دیتی ہیں۔انہوں نے کربلا کے کرداروں کو اپنی زندگی میں سمونے کی ترغیب دی ہے۔ان کی شعریات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کردار سازی میں فنکارانہ مہارت رکھتی ہیں۔ان کے نوحوں اور سلاموں میں جو علامتیں اور استعاریں موجود ہیں وہ واقعۂ کربلا کی انقلاب آفریں صدائے بازگشت محسوس ہوتی ہیں۔ذیل میں ایک سلام کے چند شعر پیش کئے جارہے ہیں:

پردیس ہے تنہائی ہے خیمے ہیں دھواں ہے
سجادؑ کے چہرے سے مگر صبر عیاں ہے

اسلام سے بھائی سے سکینہ سے محبت
عباسؑ کے سینے میں وفاؤں کا جہاں ہے
گونجی ہے بہت شام میں زینبؑ تری آواز
تقریر علیؑ کرتے ہیں سب کو یہ گماں ہے
زینبؑ سے وراثت میں حیا مجھ کو ملی ہے
تطہیر کی چادر کی مرے سر پہ اماں ہے

زینتؔ نے اپنی شعریات کو مرتب کرنے میں جن خوبصورت الفاظ کو شعر کا روپ دیا ہے اس میں حسن تراکیب کے ساتھ ساتھ واقعہ کربلا کا پیغام بھی محسوس کیا جا سکتا ہے:

دنیا میں آنے والے ہر اک انقلاب کو
تحریک دے رہا ہے بہتر کا راستہ
نیزے کا ناپ ناپ کے صدیاں گزر گئیں
کتنا بلند ہے سر سرور کا راستہ
بے شیر کی ہنسی نے کیا قاتلوں پہ وار
اپنایا شیرخوار نے حیدرؑ کا راستہ

انھوں نے اپنے ایک سلام میں انہوں نے اپنی لفظیات سے کربلا کے جیالوں کا جس انداز سے تعارف پیش کیا ہے وہ قابل دید ہے:

یہ کربلا تری آغوش میں جیالے کون
ہماری روح میں بستی بسانے والے کون
جو رنگ ملتا ہے اپنے لہو کی سرخی سے
ہتھیلیوں پہ وہ مہندی رچانے والے کون

اجالے بانٹ رہے ہیں دراز نیزوں سے
کٹے سروں کے یہ سورج اگانے والے کون

○ **بدر جہاں خورشیدؔ:** سنبھل کے محلّہ چمن سرائے کی رہنے والی پیشے سے استاد مشاعروں کی مقبول شاعرہ بدر جہاں خورشیدؔ ہیں۔ نظموں اور غزلوں کے علاوہ حمد، نعت اور سلام بھی کہتی ہیں۔ ان کے ایک سلام کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دنیا حسینؑ کی ہے زمانا حسینؑ کا
ظاہر میں کربلا ہے ٹھکانا حسینؑ کا
صدق و صفا کی صبر و تحمل کی خود مثال
دنیا میں صرف ایک گھرانا حسینؑ کا
اب زندگی کے ساز پہ کرب و بلا کے بعد
اسلام پڑھ رہا ہے ترانا حسینؑ کا
دنیا میں بن گیا ہے ترقی کی وہ مثال
جنگل میں ایک شہر بسانا حسینؑ کا

○ **عزیز زہراؔ سنبھلی:** عزیز زہراؔ بنت جناب جعفر رضا چھولسی جو محلّہ نوریوں سرائے میں سید اسماعیل حسین کی زوجہ تھیں۔ ان کے فرزند مسعود میاں کے مطابق ان کا کلام محافل اور مجالس میں خواتین پڑھا کرتی تھیں۔ ان کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں جس میں عقیدے اور عقیدت کا خوبصورت امتزاج ہے:

ذرا ٹھہرو اے نکیرو یہ لحد میں بولی زہرا
مرا مولیٰ آ رہا ہے میں ادب سے بیٹھ جاؤں

کیاان سے بھیک مانگوں ترے در کے سب بھکاری
روضے پہ ان کے آ کر سب بھیک مانگتے ہیں

○ **فدائی بانو سنبھلی:** محلّہ نوریوں سرائے کی دوسری شاعرہ فدائی بانو بنت زائر حسن مرحوم جو سید شمیم حسین کی زوجہ تھیں۔ خاتون خانہ ہونے کے ساتھ ساتھ شعر وسخن سے شغف رکھتی تھیں۔ دو شعر ان کی بیٹی نکہت زہرا صاحبہ سے دستیاب ہوئے ہیں جنہیں پیش کیا جارہا ہے:

خوش ہو کے آپ کر دئے محضر پہ دستخط
اس کمسنی میں کس نے یہ ہمت خرید لی
شداد نے بنائی جناں اور نہ جا سکا
اعجاز سے حسینؑ نے جنت خرید لی

○ **نازشؔ بریلوی:** برجیس جود خاتون نام اور تخلص نازشؔ جو ڈاکٹر ریاض الحسن ڈپٹی ڈائریکٹر سیرم انسٹی ٹیوٹ ایزٹ نگر بریلی وسابق پروفیسر ویٹینری کالج لاہور کی دختر تھیں۔ عین عنفوان شباب میں ۱۸ سال کی عمر میں ۱۵/اپریل ۱۹۳۴ء کو انتقال کر گئیں۔ ''شاعرات اردو'' کے مؤلف محمد جمیل احمد بریلوی کے مطابق مرحومہ نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ان کے اشعار کے مطالعہ سے حیرت ہوتی ہے کہ اس کم عمری میں اس قدر گہرائی وسنجیدگی اور حقائق ومعارف سے اس قدر کیسے لگاؤ ہو گیا تھا۔ مرحومہ کو مذہبیات خصوصاً رثائی ادب سے دلچسپی تھی۔ شاعرات اردو صفحہ ۶۳۴ پر ایک مسدس جو جناب زینب سلام اللہ علیہا کی شان میں ہے جس کے دو بند حاضر ہیں، جس سے ان کی شاعرانہ عظمت کا احساس ہوتا ہے:

گر باغِ امکاں پھول ہے پھولوں کی نکہت آپ ہیں
رفعت کی رفعت آپ ہیں صولت کی صولت آپ ہیں

اسلاف کی اجداد کی دنیا میں عزت آپ ہیں
حسنینؑ پر نوحہ کناں معنی رقت آپ ہیں
بنت علیؑ و فاطمہؑ بنت محمدؐ آپ ہیں
خاتون جنت کی قسم خاتونِ جنت آپ ہیں
اے زینبؑ عالی نسب یہ مرتبہ ہے آپ کا
قدسی کھڑے ہیں سرنگوں یہ دبدبہ ہے آپ کا
خورشید ہو کیسے عیاں جب سر کھلا ہو آپ کا
ہیں تابع فرماں سبھی بے شک خدا ہے آپ کا
صلوات نازشؔ آپ پر یہ ہدیۂ ناچیز ہے
کیا لائے یہ احقر بشر جو چیز ہے نا چیز ہے

درج ذیل بند میں جناب زینبؑ کے نانا سردار انبیاء حضرت ختمی مرتبت ﷺ کا تعارف بھی نازشؔ کے قلم سے قابلِ دید ہے:

وہ جد امجد آپ کے یعنی نبیؐ خیر البشر
صلو علیہ وآلہ اک شان جن کی سر بسر
وہ ساکنِ علیین ہیں جائے کہاں ان تک نظر
لولاک ان کی شان ہے کرتی ہوں میں اب مختصر
من تشنہ و دل خستہ ام ایں ہدیۂ ناکارہ است
بہر خدا نظر کرم ،ایں نازشؔ بے چارہ است

○ **شگفتہ غزلؔ:** اردو شاعرات میں بریلی کی نمائندگی کرنے والی موجودہ عہد کی اہم شاعرہ ڈاکٹر سیدہ شگفتہ غزلؔ ہیں۔ جو اپنی غزلوں کے منفرد لب و لہجے کے سبب

ہندوستان گیر شہرت کی مالک ہیں۔ ڈاکٹر شگفتہ غزؔل حکومت ہند کے محکمۂ انٹلی جنس سے وابستہ ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ اردو غزل کی آبرو بن کر عروسِ سخن کو سنوارنے میں مصروف رہتی ہیں۔ نام ونمود سے بے پرواہ ڈاکٹر شگفتہ غزؔل مشاعروں میں کم ہی جاتی ہیں لیکن اپنے منفرد لب و لہجے کے سبب ادبی حلقوں میں خاصی مقبول ہیں۔ انہوں نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ نعت، منقبت اور سلام بھی کہے ہیں۔ ان کے سلاموں میں جہاں فنکارانہ رچاؤ ہے وہیں رثائی شعریات میں عقیدت مندی کی بہترین مثال ہیں:

ہوا جو دین میں قرباں وہ گھر حسینؑ کا ہے
نماز جس نے بچائی وہ سر حسینؑ کا ہے
عبادتوں کے شہنشاہ کا ہے یہ قبلہ
ادب سے سر کو جھکاؤ یہ در حسینؑ کا ہے
نبیؐ ہیں نانا، علیؑ باپ، فاطمہؑ ماں ہیں
حسنؑ ہیں بھائی پتہ معتبر حسینؑ کا ہے
غزؔل کے واسطے دنیا کی نعمتیں بے کار
جہاں ہے سر کو جھکایا وہ در حسینؑ کا ہے

ایک دوسرے سلام میں جو حضرت عباسؑ کی شان میں ہے ڈاکٹر شگفتہ غزؔل نے اپنے استعاراتی نظام کے ذریعہ جہاں حضرت عباسؑ کے مختلف اوصاف کی عکاسی کی ہے وہیں اپنی فنکارانہ مہارت کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے:

وہ ہمارے ہیں یقیناً اور ہم عباسؑ کے
ہے تصور سے سجا دل کا حرم عباسؑ کے

ہاں تصور سے بھی بالا تر ہے ان کی شخصیت
نقش کیا بیاں کر پائیں گے اوصاف ہم عباسؑ کے
فتح کن اک مسکراہٹ تشنگی کے لب پہ تھی
موج دریا چومتی تھی جب قدم عباسؑ کے
کوئی بھی دنیا کی طاقت اب جھکا سکتی نہیں
کہہ رہا تھا آ کے ہاتھوں میں علم عباسؑ کے
غیرت انسانیت روئی دہاڑیں مار کر
جب سنا کہ ہو گئے بازو قلم عباسؑ کے
فتح کی منزل تو بڑھ کے خود ہی آئے گی قریب
دیکھ کر چلتے رہو نقشِ قدم عباسؑ کے
تجھ کو یہ دنیا مٹا کر کب کا رکھ دیتی غزؔل
شکر تو یہ ہے کہ ہیں تجھ پر کرم عباسؑ کے

○ **آمنہ خاتون**: قصبہ سیتھل ضلع بریلی کے عظیم شاعر سید وصف علی وصفؔ کی بیٹی تھیں۔ آواز بہت اچھی تھی اس لئے نوحہ خوانی اور مرثیہ خوانی میں بھی اپنے عہد میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ ان کے بڑے بھائی سید یوسف علی یوسفؔ بھی اپنے دور کے بہت بڑے شاعر تھے۔ سیدہ آمنہ خاتون نے بے شمار نوحے اور سلام کہے ہیں لیکن پردہ نشین ہونے کے سبب ان کا کلام سیتھل کی عزائی فضا ہی تک محدود رہا:

ذکر شاہ کربلا تحریر کر　　اپنا دل اپنا کلیجہ چیر کر

گر غم دنیا سے پانا ہو نجات　　اپنے دل میں کربلا تعمیر کر
شہہ کا ذکر پاک کر کے آمنہ　　تو بھی اپنی ذات عالم گیر کر
دولت دنیا سے مجھ کو کیا غرض　　ساتھ میرے مصطفیٰؐ کی آل ہے
دھڑکنیں کب ہیں شور ماتم ہے　　میرا دل ہی امامباڑہ ہے

○ **چاندنی زیدی سیتھلی:** سیدہ گل صنوور زیدی نام سیتھل کے بڑے زمین دار گھرانے کے سید کلیم حسین زیدی ابن سید شمیم حسین زیدی شمیم سیتھلی کی بیٹی ہیں۔ایم ایس ڈبلیو کر کے ایک این جی او چلا کر قوم کی خدمت کر رہی ہیں۔ان کے بڑے بھائی مشہور افسانہ نگار و شاعر حلیم زیدی ہیں۔ان کی نانی سیدہ آمنہ خاتون بھی اپنے دور کی مایہ ناز شاعرہ تھیں۔چاندنی نے غزل، نظم کے علاوہ نوحہ و سلام کہہ کر رثائی شعریات میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ان کے رثائی شعریات میں جدید لب و لہجے کی بازگشت محسوس کی جاسکتی ہے۔ان کے نوحے جہاں مبکی ہیں وہیں ان کے سلام پیغام رسانی کا کام کرتے ہیں:

میرا جنون شوق مری عاشقی حسینؑ
تم پر نثار میں مری دیوانگی حسینؑ
سامان نذر کچھ بھی نہیں ما سوائے خود
کر لیجئے قبول مری زندگی حسینؑ
کیسے سفر کرے گا اندھیرا ہمارے ساتھ
رہتا ہے پہلے نور کا کنبہ ہمارے ساتھ
بے پردگی کی تیز ہوائیں ہیں بے اثر
زینبؑ تری ردا کا ہے سایہ ہمارے ساتھ
کوثر کا جام غازی پلائیں گے چاندنی
محشر میں ہوں گی بی بی سکینہ ہمارے ساتھ

○ **نور جہاں نورؔ:** بدایوں سے تعلق رکھنے والی شاعرات میں نور جہاں نورؔ اور رسول جہاں مخفیؔ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔نور جہاں نورؔ نے نظم، غزل، نعت، منقبت اور مرثیہ سب ہی کچھ لکھا ہے۔سادگی اور صداقت کے ساتھ ساتھ نازک خیالی اور شعریت ان کی شعریات کا خاصہ ہیں جس کی وجہ سے ان کا کلام نہایت دلکش اور پر اثر ہو گیا ہے۔نورؔ کو اسلامیات خصوصاً رثائی ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ان کی ایک نظم ''شب عاشورہ'' نامکمل اور تشنہ ہونے کے باوجود ایک زبردست کامیاب نظم ہے۔ان کا مجموعۂ کلام ''خوں نابۂ دل'' ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔شاعرات اردو مؤلفہ محمد جمیل احمد بریلوی: قومی کتب خانہ بریلی: ۱۹۴۴ء ص ۳۰۔۲۹۷ پر ان کی یہ نظم موجود ہے جس میں شب عاشور کا خوبصورت منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔جس کے ابتدائی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

پڑی ٹھنڈی جو خورشید فلق کی گرم بازاری
عطا تب رات کو حق نے کیا تاج جہاں داری
نہ پہلے اور نہ پھر اس کے بشر کی یاد میں آئی
یہ وہ شب تھی جو تنہا عالم ایجاد میں آئی
یہ وہ شب تھی لٹا تھا جس میں تاج سطوتِ ملت
یہ وہ شب تھی مٹا تھا جس میں ناز شوکتِ ملت
یہ وہ شب تھی کہ تپتی ریت پر تھا حق کا دلدادہ
سحر کو جس کی رن میں لٹ گیا یثرب کا شہزادہ
یہ وہ شب تھی الم سے جس کے چرخِ پیر مضطر تھا
پیاسا تین دن کا نائب ساقیٔ کوثر تھا

خزاں کی تھی چڑھائی اور باغِ شاہ طیبہ تھا
ہواؤں کے تھے جھونکے اور چراغِ طاق کعبہ تھا
گھٹائیں چھائیں تھیں غم کی ہلال عید زہرا پر
تھے طوفانی تھپیڑے کشتیِ امید زہرا پر
علیؑ کا چاند تھا اور گرد رنج و غم کا ہالا تھا
سحر کو ہاشمی خورشید انور گہنے والا تھا

○ **رسول جہاں مخفی:** نور جہاں نورؔ کی بڑی بہن رسول جہاں مخفی بڑی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ ''عروسِ سخن'' کے نام سے ۱۹۴۰ء میں مجموعۂ کلام شائع ہوا۔ مسلمانوں کی بے کسی اور ابتری سے وہ بہت زیادہ متاثر تھیں۔ جس کا مداوا انہیں واقعہ کربلا میں محسوس ہوتا نظر آتا ہے۔ رسول جہاں مخفی نے نعتیں خوب کہی ہیں لیکن سلام کا التجائی لہجہ انہیں انفرادیت عطا کرتا ہے۔ مخفی تعلم نسواں کی حامی ہیں لیکن انہون نے اپنا نظریہ اس طرح پیش کیا:

مخفی پناہ چادر زہرا نہ چھوڑنا ☆ تعلیم نو سنا ہے کہ دشمن حیا کی ہے

انہوں نے مسلمان عورتوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ سیرت زہراؑ پر چلنے کی ترغیب دلائی ہے۔ مخفی کی نگاہ میں واقعہ کربلا ایک ایسا انقلاب آفریں واقعہ ہے جس کے ذریعہ مسلمانوں میں جوش و ولولہ بھرا جا سکتا ہے:

اب خواب فنا سے اس کو جگا پھر مسلم خوابیدہ کو سنا
جو نارۂ حق گونجا تھا کبھی میدانوں میں کوہساروں میں
اے ابر سخا یاں جھوم کے آ ہے شور عطش پیاسوں میں بپا
اے جانِ مسیحا چشم عطا اب تاب نہیں بیماروں میں

(تذکرہ شعرائے بدایوں جلد دوم: شہید حسین بدایونی: ۱۹۸۷ء: طلحہ پرنٹرس کراچی)

○ **ادا جعفری:** بدایوں سے تعلق رکھنے والی عالمی شہرت یافتہ شاعرہ ادا جعفری ہیں جو بعد میں ہجرت کر کے پاکستان چلی گئیں۔ اپنے اسلوب بیان اور انتخاب الفاظ کے ذریعہ کلام میں جو گہرائی و گیرائی اور فنی رچاؤ پیدا کیا اس نے انہیں اپنے ہم عصر شاعرات میں منفرد بنا دیا ہے۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام میں شہرِ درد، میں ساز ڈھونڈھتی رہی، غزالاں تم تو واقف ہو اور ساز سخن مقبول و معروف ہوئے۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ حمد، نعت اور متعدد سلام کہے ہیں۔ ایک سلام کے چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں جس میں ان کا منفرد انداز محسوس کیا جا سکتا ہے:

ہونٹوں پہ جن کے نام تمنا سے آئے ہیں
رنگین قبا یہ گلشن زہرا سے آئے ہیں
ہر دور کی جبیں پہ اجالا انہیں سے ہے
جس بزم میں بھی آئے مسیحا سے آئے ہیں
ہیں آرزوئے کون و مکاں فخر انس و جاں
میدان کربلا میں جو تنہا سے آئے ہیں
منزل بنے کہیں کہیں منزل نما بنے
اک نقش پا کے پھول ہیں صحرا سے آئے ہیں
یہ شان ہے انہی کی کہ آلِ رسولؐ ہیں
تشنہ دہن جو آئے ہیں دریا سے آئے ہیں
جب مرگ آبرو کی عزادار تھی وفا
پیغام زندگی لب تشنہ سے آئے ہیں

زخموں کے ہر کرن سے سحر پھوٹتی رہی
یہ آفتاب وادیٔ بطحا سے آئے ہیں
ہر بوند سے لہو کی لکھا حرف لا الہ
عنوان لوح جاں در مولیٰ سے آئے ہیں

○ **معین فاطمہ معینؔ:** بجنور کے محلّہ بخارہ کی خاتون شاعرہ معین فاطمہ نقوی ہیں جو سید طاہر حسین نقوی کی اہلیہ ہیں۔ ڈاکٹر سیدہ سبطین نقوی کے مطابق وہ رثائی ادب کی اہم شاعرہ ہیں۔ موصوفہ کے نوحے اور سلام بجنور کی بستیوں میں ایام عزا میں پڑھے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے نوحوں میں متعدد کرداروں کے بین کو پیش کر کے اپنے نوحوں کو مزید مبکی بنا دیا ہے۔ یہاں پر بطور مثال ان کے نوحے کے چند شعر پیش کئے جا رہے ہیں:

یوں شوق شہادت میں شہہ نے روتا ہوا کنبہ چھوڑ دیا
دامن سے چھڑایا بیٹی کو خواہر کو تڑپتا چھوڑ دیا
جب شاہ نے کھینچی دل سے سناں پھر بات نہ کچھا کبر سے ہوئی
وہ درد اٹھا اک ہچکی میں بس باپ کو تنہا چھوڑ دیا
ثقہ تو نہ پلٹا دریا سے تر خون میں آئے مشک و علم
یہ دیکھ کے پیاسے بچوں نے پانی کا تقاضا چھوڑ دیا
دفنا کے لحد میں اصغر کو حسرت سے یہ بولے شاہ ہدیٰ
اس عالم غربت میں بیٹا کیوں ساتھ پدر کا چھوڑ دیا
تھا کرب معینؔ اصغر کو یہی نصرت کروں بابا کی کیسے
جس وقت سنی ہل من کی صدا معصوم نے جھولا چھوڑ دیا

معینؔ کے نوحوں اور سلاموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں شعر گوئی پر

مکمل قدرت حاصل تھی۔

ضلع بجنور کے نگینے سے تعلق رکھنے والی شاعرات میں نزہتؔ عباس (پاکستان) نصرتؔ مہدی (سکریٹری اردو اکادمی مدھیہ پردیش بھوپال) ڈاکٹر مینا نقوی اور ان کی بہن علینا عترت کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ نزہتؔ عباس پاکستان کی مشہور شاعرہ ہیں ان کی بہن نصرتؔ مہدی کے بقول انہوں نے نوحے اور سلام خوب کہے ہیں لیکن سردست ان کا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

○ **مینا نقوی:** ڈاکٹر منیر زہرا مینا نقوی روہیل کھنڈ کی ادبی فضا کا ایک اہم حصہ ہیں۔ غزل اور نظم کی مقبول شاعرہ اور فکشن کی اہم قلم کار ہیں۔ ان کے متعدد مجموعے شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ پیشے سے ڈاکٹر مینا نقوی کا رثائی ادب سے خصوصی لگاؤ ہے۔ ان کی ایک رثائی نظم ''تاریخ کا چہرہ'' خاصی مقبول ہو چکی ہے جس میں انہوں نے رسولؐ خدا سے لے کر واقعہ کربلا کی تاریخ کو ایک اچھوتے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ رسولؐ اسلام کے کردار کو سمجھنے کے لئے امام حسینؑ اور کربلا کی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔ وہ کہتی ہیں:

دنیا سے کہہ رہی ہیں بہتر شہادتیں
اسلام کی بقا ہے نواسا رسولؐ کا

اپنے ایک سلام میں انہوں نے امام حسینؑ کی قربانی کو مختلف علامتوں اور استعاروں سے خوبصورت شعریات کا حصہ بنا دیا ہے۔ یہاں پر ڈاکٹر مینا نقوی کا اسلوب قابل دید ہے:

علیؑ کے لال لکھ کر صبر کی اک داستاں تم نے
مٹایا صفحۂ ہستی سے ظالم کا نشاں تم نے

سجایا دشت کے دامن کو اپنے دل کے پھولوں سے
بیاباں کو عطا کی آبروئے گلستاں تم نے
زوال اسلام کی چڑھتی جوانی پر نہ آ جائے
شبیہ مصطفیٰؐ سا دے دیا کڑیل جواں تم نے
ستارے ٹانک کر آنکھوں سے اپنی تپتے صحرا پر
زمین کربلا کو کر دیا ہے آسماں تم نے

ڈاکٹر مینا نقوی نے اپنی غزلوں میں بھی کربلائی علامتوں اور استعاروں کا خوبصورت استعمال کیا ہے:

ہماری تشنہ لبی دھوپ بن گئی شاید
جو بھاپ بن کے سمندر ہوا میں اڑتا ہے
صبر کی حد سے گزر جاتی ہے صحراؤں کی پیاس
خشک ہو جاتا ہے جب دریا ہی پانی کے لئے
غم کو معتبر جانو غم کو معتبر سمجھو
آنسوؤں کی بارش سے زندگی نکھرتی ہے

○ **علینا عترت:** ڈاکٹر مینا نقوی کی بہن علینا عترت غزل اور نظم کی معتبر آواز ہیں۔ رثائی تہذیب سے وابستگی کے سبب ان کی غزلوں میں کربلائی علامتیں اور استعارے جا بجا نظر آتے ہیں۔ علینا عترت کا خیال ہے کہ امام حسینؑ کی قربانی کے فلسفے کو عام لوگوں تک پہنچانے میں خواتین کربلا خصوصاً جناب زینب کے ایثار اور صبر کا بہت بڑا رول ہے۔ اپنے ایک سلام میں علینا عترت نے اپنے انہی خیالات کو شعری روپ دیا ہے:

اوج پر دین کی تقدیر نظر آتی ہے　　اسم زینبؑ کی یہ تاثیر نظر آتی ہے

عصمت دین کی ہر لمحہ نگہباں زینبؑ　　فاطمہؑ زہرا کی تصویر نظر آتی ہے
پنجتن پاک کا جز بن کے ابھرتی ہے کہیں　　اور کہیں حیدرؑ و شبیرؑ نظر آتی ہے
دین کے خواب کو پلکوں پہ سجانے والی　　تو خود اس خواب کی تعبیر نظر آتی ہے
خطبۂ زینبؑ دلگیر سے کھل جاتی ہے　　حق کے پیروں میں جو زنجیر نظر آتی ہے
شام و کوفہ کے در و بام لرز اٹھتے ہیں　　گونجتی تیری جو تقریر نظر آتی ہے
حرف زینبؑ ہے وہ اسلام کا تابندہ نشاں　　ہر اندھیرے میں یہ تحریر نظر آتی ہے

علینا عترت کا خیال ہے کہ اسلام کو تابندگی کا سبب کربلا کے وہ پھول ہیں جنہوں نے اپنی شہادت کے ذریعہ کائنات کے ذرہ ذرہ کو معطر کر رکھا ہے۔ ذیل میں علینا کے ایک سلام کا استعاراتی نظام ملاحظہ فرمائیں جس میں پھول کے استعارے سے کربلا کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے:

اسلام کو عطا ہوئے جب کربلا کے پھول　　راہِ نجات بن گئے فرش عزا کے پھول
یہ بس حسینؑ آپ کے گلشن کا ہے کمال　　کمھلا کے اور مہکے در فاطمہؑ کے پھول
ہر قوم کر رہی ہے تری مدح حسینؑ　　پا کر مرادیں زیرِ علم اور چڑھا کے پھول
شعلوں کی زد پہ ظلم کی آندھی کے درمیاں　　کس عزم سے کھلے رہے صبر و رضا کے پھول
عزم حسینؑ ہی سے علینا یہ فیض ہے　　کھلتے ہیں گرم ریت پہ مہر و وفا کے پھول

درج بالا میں روہیل کھنڈ کی صرف چند رثائی شاعرات کی شعریات پر اکتفا کی گئی ہے۔ جن تک راقم الحروف کی رسائی ہو سکی۔ اب بھی بہت سی شاعرات کے کلام پردۂ خفا میں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس موضوع پر تحقیق کا دامن وسیع کیا جائے تا کہ روہیل کھنڈ کی شاعرات کے رثائیات کو ان کا جائز حق مل سکے۔

○○○

تخلیق، تحقیق اور تنقید کا مثلث

نفیسؔ، ادیبؔ اور مرزا جعفر حسین

رثائی ادب کے پارکھی اور محقق ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی تصنیف ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' میں لکھا ہے:

''انیسؔ کے بعد کلاسیکی اردو مرثیے کی تاریخ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات کے نشیب وفراز میں نئی تعبیریں لیے ہوئے ہے۔ بیشتر مرثیہ نگاران حالات کی زد میں تھے۔ خاندانی مرثیہ گوشعراء بھی اس تبدیلی سے بچ نہ سکے۔ البتہ ایسے شعراء کے پاس ایک ایسا ادبی پس منظر ضرور تھا جس کے بل پر وہ اپنا باقی سفر طے کر گئے۔ انیسؔ کے صاحبزادوں میں نفیس اسی سلسلہ کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے خاندان کی فنی روایات کے امین تھے لیکن ان کے مرثیوں میں انیسؔ کے رنگ وآہنگ سے ہٹ کر بھی بعض نقوش ابھرتے ہیں۔[۱] نفیسؔ کے ایک اہم شاگرد سر راجہ محمد امیر حسن خاں حبیبؔ آف محمود آباد نے اپنے مرثیے کے ایک مصرع میں اس رنگ وآہنگ کو ع

'رزم کا ڈھنگ نیا بزم کی ایجاد نفیس'[۲] سے تعبیر کیا ہے۔

ظاہر ہے حبیبؔ کی نظر انیسؔ کے اس لائق وفائق فرزند کے مرثیوں کے ساتھ ساتھ سرخیل مرثیہ انیسؔ کے مراثی پر بھی رہی ہوگی۔ حبیبؔ نے اس تبصرے کے علاوہ ایک فارسی

قصیدہ جو حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی مدح میں ہے۔ اس کی تشبیب میں جناب نفیسؔ کی مدح میں چند شعر کہے ہیں، اس میں میر نفیسؔ کو ع

'نفیسؔ آنکہ خورشید اوج بلاغت'[۳] کہا ہے۔

علامہ جمیل مظہری مرحوم نے بھی اپنی ایک بیت میں مرزا اوجؔ مرحوم کی تخئیل کے ساتھ ساتھ نفیسؔ کی بلاغت کے قدر دان نظر آتے ہیں۔

تخئیل اوجؔ کی ہو بلاغت نفیسؔ کی
تلچھٹ مجھے بھی چاہیے جام انیسؔ کی

اس بیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا:

''اس بیت میں انیسؔ و دبیرؔ کے بعد مرثیہ گو شعراء کی دوسری نسل میں دبیرؔ کے فرزند اوجؔ کی تخئیل اور انیسؔ کے فرزند نفیسؔ کی بلاغت کو انھوں نے اپنے شعری ارتقا کے لیے مانگا ہے۔''

ظاہر ہے جمیلؔ مظہری نے اپنی رثائی شعریات کے سفر کی تکمیل کے لیے نفیسؔ کی شعریات کو ضروری سمجھا اور ان کی نظر میں مرثیہ کی شعریات انیسؔ و دبیرؔ کے ساتھ ساتھ نفیسؔ کے مرثیوں کے بغیر نامکمل ہے۔ ظاہر ہے نفیسؔ کی فصاحت و بلاغت جہاں ان کے علمی وراثت کے سبب ہے وہیں ان کی فنکارانہ مہارت انیسؔ کے ساتھ اس عہد کی ایک اور عبقری شخصیت علامہ دہر مفتی محمد عباس سوشتری کی تربیت کی بھی مرہون منت ہے۔ عزیزؔ لکھنوی نے اسکی توجیہ بیان کرتے ہوئے تحریر کیا :

''میر خورشید علی نفیسؔ جناب مفتی صاحب مرحوم سے اکثر کتب درسیہ پڑھتے تھے۔ فارسی منظومات پر اصلاح بھی کیا کرتے تھے۔''[۴]

انیسؔ اور مفتی صاحب مرحوم کی مشترکہ تعلیم وتربیت نے نفیسؔ کے یہاں ایک عالمانہ

شان وشوکت پیدا کردی۔ یہی سبب ہے کہ انیسؔ جیسی بلند قامت شخصیت کے عہد ہی میں نفیسؔ نے اپنے آپ کو ایک فنکار کی حیثیت سے تسلیم کرالیا۔ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صفدر آہ نے تحریر کرتے ہیں:

''نفیسؔ کی علمیت نے ان کے کلام کو وزنی کردیا تھا۔''۵؎

مرزا جعفر حسین مرحوم نے لکھا ہے:

''میر انیسؔ کے انتقال کے بعد ان کے اخلاف میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے فنون تقریباً پچاس برسوں تک کامیابی کے ساتھ برقرار رہے تھے۔ پہلے خود انھیں کے صاحبزادے خورشید علی نفیسؔ نے اپنے والد بزرگوار کی یادتازہ رکھی تھی اور ان کی جانشینی کا حق ادا کیا۔''۶؎

لڈن صاحب فائزؔ نے اپنے مرثیے کے ایک بند میں مرزا جعفر حسین کی تائید درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

دل میں ہر ایک کے راسخ تھا یہی بعد انیسؔ — اٹھ گیا ملک فصاحت کا جو تھا راس ورئیس
جانشیں ان کے ہوئے جد مرے بانفس نفیس — آج مشہور جو اقلیم سخن میں ہیں نفیسؔ
ہے جو قانون تمدن وہ کلام ان کا ہے
جس کا سکہ ہے ہر اک دل پہ وہ نام ان کا ہے

مرزا جعفر حسین اس شخصیت کا نام ہے جنھوں نے اودھ کی تہذیبی وادبی بہار کو اپنی آنکھوں سے اجڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات میں جہاں گنگا جمنی تہذیب کا بیان کیا ہے وہیں اس تہذیب وتمدن کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، جو رثائی ادب سے عبارت ہے اور جس نے دنیا بھر کی تہذیبوں میں لکھنؤ کی تہذیب کو منفرد بنادیا۔ موصوف جہاں مرثیوں کی اعتقادی حیثیت پر گفتگو کرتے ہیں وہیں عہد نفیسؔ کی مرثیہ گوئی ومرثیہ خوانی کی فنی

اور لسانی اہمیت کو بھی اجاگر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے لکھا:

''ان مرثیہ خوانی کی مجلسوں کو خالص فنی اور ادبی اعتبار سے سنا اور پرکھا جاتا تھا۔ مرثیہ گو حضرات ایک دوسرے کے اوپر سبقت کا اعلان کرنے کی غرض سے خودستائی اور تعلّی کے مقامات بڑے زور وشور سے نظم کرتے اور دوسرے مرثیہ گو حضرات کی سابقہ مجالس میں پڑھے ہوئے معرکۃ الآراء مقامات کا جوابات نظم کرکے سناتے تھے۔ اس طرز عمل کو 'ٹکر لینا'' کہتے تھے اور اسی 'ٹکر لینے' کی بنا پر یہ مجالس 'اکھاڑے' کی کہلاتی تھیں۔ ان کے تذکرے ایک سال کی مجالس کے بعد سے دوسرے برس کی مجلسوں تک برابر ہوا کرتے تھے۔ حضرات لکھنؤ مجلسوں میں بڑے ذوق وشوق سے شرکت کرتے اور دل کھول کر بڑی بلند آوازوں میں تعریفیں کرتے تھے۔ اپنے پسندیدہ بالخصوص صاحبان کمال یا صاحبان ثروت مرثیہ گو کی تعریفوں میں واہ واہ کرکے نعروں سے چھتیں ہلادیتے تھے۔''۷؎

ظاہر ہے ان حالات سے نفیسؔ کو بھی گذرنا پڑا۔ نفیسؔ کو 'ٹکر لینے' کے مرحلے سے اپنے ایک شاگرد نواب سردارؔ سے دوچار ہونا پڑا، جس کا ذکر مرزا جعفر حسین نے بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ اس انداز بیان میں مرزا صاحب نفیسؔ کے ساتھ ساتھ نواب سردارؔ کا تعارف بھی اس طرح پیش کرتے ہیں کہ نفیسؔ اور سردارؔ دونوں کی شخصیت قاری کے سامنے آجائے وہ بیان فرماتے ہیں:

''سردار صاحب کا اسم گرامی نواب قمرالدین حیدر المعروف بہ نواب

سردار صاحب تھا۔ وہ ایک بڑے متمول گھر کے چشم و چراغ اور ایک دریادل رئیس تھے۔ان کو اپنے بزرگوں سے متروکہ میں کثیر جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کے علاوہ سولہ لاکھ روپیہ نقد ملا تھا اور یہ سب رقم ان کی حیات میں ختم ہوگئی تھی حالانکہ انھوں نے صرف اڑتالیس برس کی عمر پاکر ۱۹۱۳ء میں انتقال فرمایا تھا۔ان کو مرثیہ کہنے،مجلسیں پڑھنے اور بڑے بڑے حصے تقسیم کرنے کا والہانہ ذوق تھا۔ابتداء میر نفیس کے آگے زانوئے ادب طے کیا تھا لیکن ان میں ریاست کی آن بان تھی اور نفیس اپنے پدر بزرگوار کی طرح نازک طبیعت اور مستغنی مزاج تھے اس لیے شاگردی اور استادی کا یہ رشتہ منقطع ہوگیا اور سردار صاحب نے علی میاں کامل سے تلمذ حاصل کرلیا۔سردار صاحب کی برہمی اس حد تک ختم نہیں ہوئی اور انھوں نے نفیس کا جواب بلکہ بہتر جواب پیش کرنے کا فیصلہ کرلیا۔اس زمانہ میں میر نفیس کا ایک مرثیہ شعر وفن کا ایک معجزہ سمجھا جاتا تھا۔سردار صاحب نے خوش اعتمادی سے اسی کے جواب میں ایک عظیم الشان اجتماع میں پڑھ دیا۔'' ۸

مرزا جعفر حسین نے نفیس اور سردار کے مرثیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''اس وقت بھی بہت سے ادیب ونقاد یہی سمجھتے تھے اور آج بھی راقم اس رائے کا حامل ہے کہ مرثیہ میں تمام مخصوص مقامات علی میاں کامل کے تصنیف کردہ تھے کیونکہ انھیں کا رنگ وطرز ہر ایسے مقام پر پوری طاقت سے جھلکتا نظر آتا ہے، جہاں مقابلہ ندرت کے ساتھ کیا گیا تھا۔'' ۹

مرزا جعفر حسین نے تین مقامات کا موازنہ پیش کیا ہے جسے ذیل میں پیش کیا جارہا

ہے تاکہ قارئین میر نفیس اور نواب سردار دونوں کے کلام سے استفادہ کرتے ہوئے کوئی مثبت رائے قائم کرسکیں جبکہ دونوں مرثیوں کا موضوع سخن ایک ہی ہے:

نفیس کے مرثیہ کا مطلع اور دوسرا بند حسب ذیل ہے:

مری زباں کو شرف مدح پنجتن سے ملا　　سخن کا تاج جو گل تھا وہ اس چمن سے ملا
یہ رتبہ فاطمہؑ وحیدرؑ وحسنؑ سے ملا　　یہ سب عروج ثنائے شہ زمن سے ملا
یہ پایہ سبط پیمبر سے میں نے پایا ہے
یہ پایہ صاحب ممبر سے میں نے پایا ہے

خود اپنے اوج پہ نازاں ہوں انکسار کے ساتھ　　یہ بے خزاں مجھے گلشن ملا بہار کے ساتھ
جناں میں جاؤں گا محبوب کردگار کے ساتھ　　کہ عشق ہے مجھے حیدر کے گل عذار کے ساتھ
چراغ مہر سے روشن چراغ دیکھوں گا
یہ باغ دیکھ چکا اب وہ باغ دیکھوں گا

مرزا جعفر حسین مرحوم نے لکھا:

''نفیس کا مرثیہ ۱۵۸/اور سردار صاحب کا مرثیہ ۱۲۸ بندوں پر مشتمل ہیں۔نفیس کے مرثیہ میں اس صنف سخن کے ان تمام اجزائے ترکیبی پر نظر رکھی گئی ہے، جن کی بہترین مثالیں انیس نے پیش کی تھیں۔سردار صاحب کے یہاں مرثیہ کے بعض اہم مقامات کو نظر انداز کردیا گیا ہے یا زیادہ توجہ نہیں کی لیکن ٹکر لینے کا حوصلہ مرثیہ کی ابتدا ہی سے نظر آتا ہے۔پہلے بارہ بندوں میں گیارہ صرف خودستائی، خودنمائی اور تعلّی پر مبنی ہیں۔انھیں ربط دے کر بارہویں بند میں نفیس کے مطلع کا جواب ہے۔'' کہتے ہیں:

یہ فیض مجھ کو ثنائے شہ زمن سے ملا　　یہ درّ بیش بہا مدح کے عدن سے ملا
ثمر نہالِ بلاغت کا اس چمن سے ملا　　یہ امتیاز در قصر پنجتن سے ملا
کہ میری نظم کا آوازہ دور تک پہنچا
فروغ نام کا ایوان حور تک پہنچا

مرزا جعفر حسین نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''نفیسؔ کے یہاں اپنے کمال پر فخر و مباہات کے ساتھ اظہار انکسار ہے لیکن سردارؔ کے یہاں مرثیہ کے اصل مطلع میں بھی افتخار کا پہلو نمایاں ہے۔ یہ بھی غنیمت تھا کیونکہ سردارؔ صاحب بہر حال ایک مقتدر اور محتشم رئیس تھے لیکن آگے چل کر نفیسؔ کے صرف دو بندوں کا جواب چودہ بندوں میں دیا گیا ہے۔''[۱۰]

ذیل میں وہ دو بند پیش کیے جاتے ہیں جو حضرت علیؑ کی مدح میں ہیں اور ان کے عقد کا تذکرہ ضمناً کیا گیا ہے۔

دیا وہ حق نے برادر کو جو حبیب خدا　　ملی وہ خلق میں بی بی جو بنت خیر ورا
جناب فاطمہؑ صدیقہ طاہرہ زہرا　　علیؑ نہ ہوتے تو پھر ان کا کوئی کفو نہ تھا
سب اپنی نعمتوں کا ان پہ اختتام کیا
کہ ان کے بیاہ کا خود حق نے اہتمام کیا

بتول کو وہ دیا کردگار نے رتبا　　کہ جس کی کرتے تھے تعظیم خود رسول خدا
نہ آسیانے نہ مریم نے یہ شرف پایا　　انھیں کا پیش خدا عرش حق پہ عقد ہوا
دکھائیں خلد میں شکلیں عجب سروروں نے
کہ پھول ان پہ نچھاور کیے تھے حوروں نے

مرزا جعفر حسین نے میر نفیسؔ کے درج بالا بندوں پر تبصرہ کرتے ہوئے سردارؔ کے بندوں پر بھی اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا:

''سردارؔ کے مرثیہ میں شادی کی یہ رسم بڑے اہتمام کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ علیؑ کو رسولؐ اسلام ان کے گھر طلب کرتے ہیں، زبان وحیٔ التیام سے عقد مناکحت کا حکم من جانب خدائے بزرگ و برتر سناتے ہیں، بہشت میں شادی کی ترتیب ہوتی ہے اور عرش معلیٰ سے یہ صدا آتی ہے کہ ''ولیمہ آج ہے جنت میں ان کی شادی کا'' کیوں کہ ''پڑھا ہے فاطمہ کے ساتھ ہم نے عقد اس کا'' یہ صدا سن کر بہشت میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے، حور و غلماں خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے۔''[۱۱]

مرزا جعفر حسین کے مطابق یہ منظر نامہ چودہ بندوں پر مشتمل ہے لیکن انھوں نے اس مقام پر صرف آٹھ بند پیش کیے ہیں:

صدا یہ سن کے ہے سکّان خلد کا دل شاد　　چہار سمت ہے ہنگامۂ مبارک باد
خوشی سے جھومتے ہیں قدسیانِ پاک نژاد　　نشاط حوروں کو فردوس میں ہے حد سے زیاد
جناں کی نہروں میں فوارے ساتھ چھٹتے ہیں
ہر اک روش پہ نچھاور کے پھول لٹتے ہیں

وہ حوریں اور وہ ان کے قدوں کی رعنائی　　وہ سادے سادے لباس اور وہ ان کی زیبائی
وہ مل کے ابروؤں کی دلبری دل آرائی　　کسی حسین نے گویا کہ لی ہے انگڑائی
وہ حسن طوق کا زینت وہ گوشواروں کی
وہ ماہ نو کی ضیا وہ چمک ستاروں کی

نکل کے قصر سے طوبیٰ کے سایہ میں آنا وہ سینہ تان کے چلنا وہ ان کا اٹھلانا
وہ ہاتھ ڈالے گلوں میں ادھر ادھر جانا وہ دیکھ دیکھ کے آئینہ اور اترانا
ادھر کو حوروں کو مجمع ادھر کو غلماں کا
سماں ہے گلشن فردوس میں پرستاں کا

لباس نور کے پہنے ہیں جسم میں غلماں لٹا رہے ہیں درو لعل خازنان جناں
کیا ہے جشن کا حوران خلد نے ساماں چنی ہے چاند سے ماتھوں پہ نور کی افشاں
خجل ہو جن سے کواکب کی ضو وہ گہنے ہیں
نکھر کے چمپئی جوڑے سبھوں نے پہنے ہیں

بیان کیا ہو صفت ان کے حسن کی پوری وہ لال ڈورے وہ آنکھیں ہراک کی مخموری
وہ رنگ ساعد و بازو کا ان کے بلوری وہ ساق یا کہ خجل جس سے شمع کافوری
وہ لب کہ دیکھ کے رنگت ہو زرد سوسن کی
ہنسیں تو کھل گئیں کلیاں ہوا سے گلشن

کرشمے آنکھوں کے سفاک چتونیں قتال وہ گدری چوٹیاں ان کی وہ لمبے لمبے بال
وہ حسن سیب ذقن کا وہ گورے گورے گال ملے فرشتوں کے دل اس بلا کی پیاری چال
وہ غمزے حشر بپا جن سے پارساؤں میں
لگاوٹوں کی نظر بانکپن اداؤں میں

وہ مانگیں کا ہکشاں سی وہ آنکھ کا کاجل وہ رنگ باہوں کا شرمندہ جس سے ہو صندل
وہ گردنوں کا بیاض اور وہ کاکلوں کا بل سروں پہ ڈالے ہوئے وہ حباب سے آنچل
لچک کمر کی غضب گردشوں میں ڈھاتی ہے
کہ بجلیاں دل عشاق پر گراتی ہے

ملائکہ میں ہے غل ہر طرف کہ صل علا سوا علیؑ کے یہ رتبہ کسے جہاں میں ملا
نبیؐ سے چل کے کہا اے رسولؐ ہر دوسرا مبارک آپ کو تزویج صدرو زہرا
نہ شادیاں کبھی ایسی ہوئیں نہ بیاہ ہوئے
خدا نے عقد پڑھا انبیا گواہ ہوئے

درج بالا بندوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مرزا جعفر حسین نے مرثیہ کے جمالیاتی پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا:

''متذکرہ بالا بند اس زمانہ کے جمالیاتی ذوق کے یقیناً ترجمان ہیں اور ان کا مطالعہ اسی نظریے کے تحت کرنا چاہیے۔''

لیکن آگے انھوں نے یہ جملہ بھی تحریر کر دیا:

''مرثیہ میں یہ تذکرے اگر شامل نہ ہوتے تو بہر حال بہتر تھا۔''[۱۲]

مرثیہ نگاری میں سیرت نگاری اور بین کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ مرثیہ میں شہادت علی اصغرؑ کا بیان ہے۔ اس موقع پر امام اور مادر شیر خوار کے مکالمہ کو مرزا جعفر حسین نے پیش کیا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے نفیسؔ کے درج ذیل مکالماتی بند پیش کیے:

حسینؑ جب علیؑ اصغر کو دفن کر کے پھرے اٹھا کے رنج و الم پارۂ جگر کے پھرے
مزار سے بصد اندوہ و غم پسر کے پھرے سوئے خیام حرم سرد آہ بھر کے پھرے
بکا کرو یہ دل بے قرار کہتا تھا
جگر میں درد تھا بازو سے خون بہتا تھا

پکاری ڈیوڑھی سے بانو مرا پسر ہے کہاں خدا کے واسطے کہیے وہ سیمبر ہے کہاں
جہاں ہے آنکھوں میں تیرہ مرا قمر ہے کہاں سرور جان و دل مادر و پدر ہے کہاں
صغیر لال سے کیوں منہ کو موڑ آئے ہو
ستمگروں میں کہاں اس کو چھوڑ آئے ہو

اسے فرات سے سیراب بھی کیا کہ نہیں　　کسی نے تھوڑا سا پانی اسے دیا کہ نہیں
ثواب یہ کسی بے رحم نے لیا کہ نہیں　　گلا تو خشک تھا قطرہ کوئی پیا کہ نہیں
ہمارے حق کی خوشی اٹھ گئی زمانے سے
کلیجہ پھٹتا ہے تنہا تمہارے آنے سے

کہا حسینؑ نے وہ بھی ہوئے شہید جفا　　ملا نہ پانی کا قطرہ گلے پہ تیر لگا
یہ خون انھیں کا مری آستیں میں سب ہے بھرا　　اگل اگل کے لہو مرگیا وہ ماہ لقا
کوئی نہ پائے جو دکھ ہم نے پائے ہیں بانو
انھیں سپرد لحد کرکے آئے ہیں بانو

تمہارے لال کو لے جاکے رن میں پچھتایا　　ترس کسی نے نہ بچہ کے حال پر کھایا
لحد تو مل گئی لیکن کفن نہیں پایا　　اسی لہو بھرے کرتے میں ان کو دفنایا
وفور غم سے کہاں تاب صبر ہے بانو
وہ سامنے علی اصغر کی قبر ہے بانو

یہ سن کے بانوئے بے کس کا غیر حال ہوا　　پکاری ہائے مرا شیر خوار مجھ سے چھٹا
ارے مرے علی اصغر یہ ماں ہو تجھ پہ فدا　　لہو میں تر ہوئے دو دن کی پیاس میں بیٹا
وہ جسم پھول سا اب اور گرم ریتی ہے
تمہاری قبر کی اماں بلائیں لیتی ہے

مرزا جعفر حسین نے درج بالا بندوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک غیر جانبدار ناقد کا فریضہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے جہاں سرداؔر کی خامیوں کی نشاندہی کی وہیں نفیسؔ کی گرفت کرتے ہوئے ان کی کردار نگاری کا اعتراف بھی کیا ہے۔

''انیسؔ نے کردار نگاری کا جو معیار قائم کیا تھا، اس کے مطابق متذکرہ

بالا پانچویں بند میں لفظ 'پچھتایا' امام کی سیرت کے منافی ہے۔ اس کمزوری کے علاوہ نفیسؔ نے اس مکالمہ کو کچھ اس طرح نظم کر دیا ہے، جس کا جواب ممکن ہی نہیں تھا۔''[۱۳] مرزا جعفر حسین کا خیال ہے کہ سرداؔر صاحب کا مرثیہ نقش ثانی ہے جو نقش اول کو سامنے رکھ کر نظم کیا گیا تھا۔ پھر بھی وہ بات نہ آئی جو نقش اول میں تابندہ اور درخشندہ ہے۔''

مرزا جعفر حسین کی ناقدانہ تحریر کے بعد سرداؔر کے بند بھی دیکھیں:

بنا کے قبر جو بے شیر کی پھرے سرور　　ہر ایک گام پہ گرتے تھے بادلِ مضطر
ہوا تھا حال یہ آنکھوں کا غم سے رو رو کر　　حرم سرا کی نہ آتی تھی راہ شہ کو نظر
بیان اپنی مصیبت کا کرتے جاتے تھے
ہر اک قدم پہ دم سرد بھرتے جاتے تھے

محل کے در پہ جو پہنچے امام جن و بشر　　پکاری پردے کے پاس آکے بانوے مضطر
قبائے پاک ہے رنگیں لہو سے سرتاسر　　کہاں ہے ہنسلیوں والا میرا علی اصغر
اکیلے آئے اسے گود میں نہ لے آئے
کسے حضور مرے ماہ وش کو دے آئے

گئے تھے آپ اسے لے کے گود میں آقا　　حضور آئے نہ آیا وہ اس کا باعث کیا
کریں تو آپ کچھ ارشاد اے شہ والا　　کسی نے کھا کے ترس آب نہر اس کو دیا
قلق سے صدقے گئی اس کا حال کیا ہوگا
ہزار چین سے ہو ماں کو ڈھونڈھتا ہوا

یہ سن کے پہلے تو روئے بہت شہ دل گیر　　جگر سنبھال کے بانو سے پھر یہ کی تقریر
گیا جہاں سے پیاسا وہ رشک ماہ منیر　　ملا نہ آب لگا چاند سے گلے پہ تیر

روانہ نہر لبن پر وہ لالہ فام ہوا
ہماری گود میں دم توڑ کر تمام ہوا

گیا جہان سے دادی کے گھر وہ ماہ جبیں — قبا ہماری اسی کے لہو سے ہے رنگیں
تمہاری گود میں اس وقت تک رہا وہ حسیں — اب آج سے علی اصغرؑ کی جا ہے زیر زمیں
تمہارے لال کی تربت بنا کے آئے ہیں
ابھی ہم اس کو لحد میں سلا کے آئے ہیں

سنا جو بانوئے مضطر نے شاہ کا یہ بیاں — گری زمیں پہ ہوا یوں زوال تاب و تواں
پکاری چھوڑ کے اوسان خلق میں نالاں — بلالو اے علی اصغر مجھے بھی تم ہو جہاں
سفر میں داغ جدائی کا دے گئے بیٹا
لحد میں ساتھ نہ مادر کو لے گئے بیٹا

مرزا جعفر حسین نے اس کے بعد مجموعی تاثر ظاہر کرتے ہوئے لکھا:

’’ظاہر ہے کہ سردارؔ کے ان بندوں کو نفیسؔ کے کلام سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ مولویت ضرور ہے لیکن نہ کردار نگاری ہے اور جذبات کی دلوں کو متاثر کرنے والی ترجمانی۔ پھر بھی مجلس میں سامعین نے دھومیں مچادی تھیں اور بڑی بڑی تعریفیں ہوتی تھیں۔ حالانکہ نفیسؔ کے مرثیے کے متعلقہ مقامات زبان زد تھے اور نجی صحبتوں میں نفیسؔ کے بند پڑھے اور دل کھول کر داد سخن دی جاتی تھی۔‘‘[۱۴]

درج بالا سطور میں مرزا جعفر حسین مرحوم کے حوالے سے اس لیے گفتگو کی گئی ہے کہ رثائی ادب کے اس ناقد سے مرثیہ کے قارئین متعارف ہو جائیں لیکن مرثیہ کے حوالے سے سرزمین لکھنؤ کی ایک اہم شخصیت کا ذکر کیا جا رہا ہے، جس کے بغیر تاریخ مرثیہ، مرثیہ اور

تحقیق مرثیہ ادھوری سمجھی جاتی ہے اور وہ اہم نام سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ مرحوم کا ہے۔ نوجوان ادیب، رثائی ادب کے عاشق اور مشہور خطیب سید ارتضیٰ عباس نقوی نے جواہر کے دوسرے تیسرے شمارے (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء و اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء) میں وہ نایاب فہرست شائع کر دی ہے جو ذخیرۂ ادیب مرحوم کی شکل میں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ اس ذخیرہ کے تعلق سے سید ارتضیٰ عباس نقوی رقم طراز ہیں:

’’مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کی پوری زندگی رثائی ادبیات کے لیے وقف تھی۔ ذاتی ذخیروں سے لے کر نخاس کے بازار تک شاید ہی کوئی ایسا ذخیرہ ہو جہاں تک وہ نہ پہنچے ہوں۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کی باتیں اس کے علاوہ ہیں۔ گھر پر جلد ساز اور منشی موجود رہتے تھے، جن سے وہ پنا کام لیتے تھے زندگی بھر کے جمع شدہ قلمی مرثیوں کو انھوں نے مرتب کر کے جلدوں میں بندھوا دیا تھا اور ہر جلد کے شروع میں علیحدہ سے کاغذ لگا کر مرثیوں کی فہرستیں بھی بنا لیں تھیں۔ مشہور مرثیہ نگاروں کے مرثیے علیحدہ جلدوں میں کیے جیسے افسردہ، احسانؔ، خلیقؔ، ضمیرؔ، فصیحؔ، انیسؔ، دبیرؔ، انسؔ، مونسؔ، نفیسؔ وغیرہ۔ باقی جو متفرق شعراء تھے ان کے مرثیے ۶ جلدوں میں رکھے جو بہ اعتبار تہجی تخلص شعراء مرتب ہیں۔ اس کے علاوہ باقی جلدوں میں متفرق مرثیے، سلام، نوحے، مخمسات اور رباعیات وغیرہ ہیں۔ انھوں نے یہ ذخیرہ زندگی کے آخری دنوں میں مالک رام کے ہاتھوں علی گڑھ یونیورسٹی کو بہت معمولی قیمت میں فروخت کر دیا تھا۔ اب یہ ذخیرہ مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ) کا حصہ ہے۔‘‘[۱۵]

ارتضیٰ عباس نقوی نے جو فہرست شائع کی ہے وہ اس فہرست مخطوطات کا حصہ ہے، جو مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ) کی فہرست مخطوطات ہے۔ ارتضیٰ عباس نقوی نے رثائی ادب کے محققین کے لیے رثائی فہرست شائع کر کے ایک مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ اس فہرست کے مطابق نفیسؔ کے مخطوطہ مرثیے متعدد جلدوں میں موجود ہیں لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کتنے اور کون کون سے مرثیے ذخیرۂ ادیب میں نفیسؔ کے موجود ہیں۔ ذخیرۂ ادیبؔ میں جو مرثیے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہیں اس کی تفصیل ذیل میں پیش کی جارہی ہے تاکہ نفیسؔ کے مرثیوں کے تعلق سے مکمل صورت حال سے واقفیت ہوجائے۔ اس فہرست میں سب سے پہلے UN-567 پر ''مراثی خلیق وخلاف خلیق'' کے نام سے پہلا مخطوطہ ہے، جسے نفیسؔ کے درج ذیل موجود ہیں۔

اس جلد میں پہلا مرثیہ ۳۴ بند پر مشتمل ہے، جو نمبر شمار ۳۲ پر موجود ہے۔ اس کا مطلع و مقطع پیش کیا جارہا ہے:

شبیر جدا ہوتے ہیں ناموس نبی سے — چھٹتے ہیں حرم سبط رسول عربی سے
حضرت کو نہیں تاب سخن تشنہ لبی سے — مضطر ہے بہن بھائی کی رخصت طلبی سے
ہتھیار لگائے شہ دلگیر کھڑے ہیں
حیران دم صورتِ تصویر کھڑے ہیں

خاموش نفیسؔ اب کہ ہے دلپر غم جانکاہ — لکھ آگے نہ تاراجی بیت الشرف شاہ
آقا سے یہ کر عرض کہ اے کل کے شہنشاہ — اس سال تو روضہ پہ طلب کیجئے للہ
یہ خاص غلام آپ کا مجبور ہے آقا
گر جلد طلب کیجئے کیا دور ہے آقا

نمبر شمار ۳۵ پر دوسرا مرثیہ ۴۵ بند پر مشتمل مطلع اور مقطع حاضر ہے۔

جب تیغ ظلم سے سر سرور جدا ہوا — یاد اہلبیت سے محشر بپا ہوا
بولے ملک فلک پہ کہ ہے ہے یہ کیا ہوا — پیاسا شہید فاطمہؑ کا لاڈلا ہوا
سر پیٹو مومنو کہ زمانہ الٹ گیا
خنجر سے وقت عصر سرِ شاہ کٹ گیا

ٹکڑے جگر کے ہوگئے بس اے نفیسؔ بس — نالاں ہے اب تو سینہ میں دل صورت جرس
دنیا کو خوب دیکھ چکے کچھ نہیں ہوس — خالق چھڑائے ہند کی زحمت سے اس برس
سلطان کربلا غربا پروری کرے
چلتے ہیں خضر بخت اگر رہبری کرے

تیسرا مرثیہ نمبر شمار ۳۶ پر ۳۴ بند پر مشتمل ہے اور اس کا مطلع اور مقطع حاضر کیا جارہا ہے۔

جب شہ پہ ستمگاروں کا نرغہ ہوا رن میں — اور گھر گیا وہ فاطمہؑ کا چاند گہن میں
رونے کا ہوا غل حرم شاہ زمن میں — بے چین ہوئے احمدؐ مختار کفن میں
ہر صف سے چلے وار غریب الغربا پر
پڑنے لگیں تیغیں خلف شیر خدا پر

خاموش نفیسؔ اب کہ یہ ہنگام فغاں ہے — نہ طاقت تحریر ہے نہ تاب بیاں ہے
احوال ترا سب ترے آقا پہ عیاں ہے — کیا غم ہے کہ وہ عقدہ کشائے دوجہاں ہے
کمتی نہیں سرکار شہنشاہ زمن میں
سو مشکلیں آسان ہیں اک چشم زدن میں

(۲) دوسرا نسخہ UN-579 مراثی انیس وخاندان انیس ہے۔ جس میں انیسؔ کے ۲۳، السؔ کے ۱۳، مونسؔ کے ۳۳، نفیسؔ کے ۱۵، وحیدؔ کے ۵، سلیسؔ کے ۳ یعنی کل ۹۳ مرثیے ہیں۔ اس جلد کے تعلق سے مسعود حسن رضوی ادیبؔ مرحوم نے جلد پر ایک نوٹ تحریر کیا ہے۔

''یہ مراثی آغا حسن لطفؔ مرزا آغا خاں نے دو مہینے میں لکھ کر ۱۵/ جمادی الاول ۱۲۸۷ھ کو تمام کی۔ آغا حسن کا نام طوبا تھا، میر انیسؔ کے شاگرد تھے۔ یہ جلد ان کے بھانجے حسن رضا عرف جھمن صاحب کے پاس تھی۔ میں نے ان کے بیٹے اصغر حسین مرثیہ خواں سے خریدی۔'' (مسعود حسن رضوی) ذیل میں ''مراثی انیسؔ و خاندان انیس'' میں موجود نفیسؔ کے مرثیوں کی فہرست پیش کی جارہی ہے:

(۱)	کس اشک کا دانہ درمکتوں سے فزوں ہے	نمبر شمار ۱۶	۱۲۱ بند
(۲)	جب رات عبادت میں بسر کی شہ دیں نے	// ۱۷	۱۴۶
(۳)	پھر طبع سلیم انجمن آرائے سخن ہے	// ۴۵	۱۷۴
(۴)	اے بوستان طبع دکھا پھر بہار نظم	// ۴۶	۱۲۹
(۵)	آشفتہ گیسوئے دل آرام سخن ہوں	// ۴۸	۱۵۳
(۶)	اے شمع دودمان تجلی ضیا دکھا	// ۵۰	۱۳۰
(۷)	ہاں اے قلم صدق رقم، نور فشاں ہو	// ۶۱	۱۲۴
(۸)	ہاں اے سنان غم جگر و دل کے پار ہو	// ۶۹	۱۲۸
(۹)	برباد وہ کشور ہے کہ سلطاں نہیں جس میں	// ۷۸	۱۶۹
(۱۰)	پھر بادشاہ ملک سخن حکمراں ہو آج	// ۸۰	۱۵۴
(۱۱)	عنواں طراز نامۂ نو ہے زباں مری	// ۸۲	۱۴۳
	(یہ مرثیہ 'بزم نفیسؔ' مطبع اثنا عشری دہلی میں شائع ہوا ہے)		
(۱۲)	پہنچے عراق میں جو ستارے حجاز کے	//۸۴	۱۵۹
(۱۳)	ہاں اے عروس حجلۂ اعجاز رو دکھا	//۸۶	۱۸۴
(۱۴)	طبع روشن ہے مری شمع شبستاں سخن	//۹۱	۱۶۹

(۱۵)	جب گیسوئے مشکیں کی گرہ شام نے کھولی	//۹۳	۱۵۸

(۳) تیسرا نسخہ UN-585 ''مراثی نفیسؔ ہے''[۱۸] جس میں نفیسؔ کے ۳۸ مرثیوں کی فہرست ہے، جس میں نمبر شمار ۱۴ پر مونسؔ کا اور نمبر شمار ۱۶ پر انیسؔ کا مرثیہ ہے جو بقول ادیب مرحوم میر نفیسؔ کا نوشتہ ہے۔ جس کا مطلع اور مقطع ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) ۱۳۱ بند پر مشتمل روز عاشورہ کے بیان میں ہے۔ مرقومہ ۱۲۹۷ھ۔

جب عابدوں کو طاعت رب میں بسر ہوئی — سجدوں میں حق کی وہ شب طاعت بسر ہوئی
صف بستہ قتل شہ پہ ادھر فوج شر ہوئی — سارے نمازیوں کی جماعت ادھر ہوئی
وردی بچھی جنود ضلالت پناہ میں
ڈنکا ہوا اذاں کا خدا کی سپاہ میں

بس اے نفیسؔ تاب بیاں کی نہیں ہے اب — یاں ہیں عاشقان شہنشاہ تشنہ لب
درگاہ حق میں عرض یہ کر اب بصد ادب — ہو آبرو عطا مجھے بہر شہ عرب
برآئے مدعائے دلی اس غلام کا
دیکھوں مزار سبط رسالتمآب کا

(۲) ۸۳ بند پر مشتمل حضرت علی اکبر کے حال کا ہے۔ نوشتہ آغا حسن۔

یعقوب مصطفیٰ سے جو یوسف جدا ہوا — یعنی شہید اکبر گلگوں قبا ہوا
ناموس شہ میں شور قیامت بپا ہوا — آفت میں فاطمہ کا پسر مبتلا ہوا
بہتا تھا خوں زمیں پہ تن پاش پاش سے
لپٹی ہوئی ہے اکبر مہرو کی لاش سے

بس اے نفیسؔ روک لے کلک گہر فشاں — تاراجیِ خیام کا آگے نہ کر بیاں
گو گوہر سخن کا نہیں کوئی قدر داں — شبیر موتیوں سے بھریں گے ترا دہاں

شہرہ جناں میں کیوں نہ ہو تیرے کلام کا
ذاکر ہے تو حسین علیہ السلام کا

حاشیہ میں آخری مصرع 'مداح ہے تو سبط رسول انام کا' بھی لکھا ہوا ہے۔

(۳) امام حسینؑ کے حال پر مشتمل ۱۲۸ بند۔ کتابت بہت خراب و خستہ جسے پڑھنا مشکل ہے۔ نوشتہ ۴/اپریل ۱۹۱۱ء مطابق ۳/ربیع الاول ۱۳۲۹ھ۔

پہنچے عراق میں جو ستارے حجاز کے — پھیلی ضیا قدم سے ہر اک سرفراز کے
لب پر سخن یہ تھا شہ عاجز نواز کے — احساں نیاز مند یہ ہیں بے نیاز کے
مانع نہ راستے میں کوئی اور شے ہوئی
کیا سخت تھے یہ راہ یہ کیا جلد طے ہوئے

(۴) یہ مرثیہ ۱۶۸ بند پر مشتمل جناب حضرت عباس کے حال کا ہے:

طبع روشن ہے مرے شمع شبستان سخن — حسن بندش سے نمودار ہے لمعان سخن
نظم ہے درِّ گراں مایۂ عمان سخن — ہے زباں بلبل خوش لہجۂ بستانِ سخن
سحر و شام عجب سیر کیا کرتا ہوں
مثل قمری اسی گلزار کا دم بھرتا ہوں

خاک اڑانے لگے سر پر وہ حزین و ناشاد — آل احمدؐ میں ہوا شور و بکا و فریاد
بس نفیسؔ آگے نہ لکھ حال شہ نیک نہاد — اب دعا مانگ بصد عجز کہ اے رب عباد
آرزو یہ ہے کہ دربار حسینی دیکھوں
روضۂ پاک علمدار حسینی دیکھوں

(۵) یہ مرثیہ حضرت حر کے حال کا ۱۷۳ بند پر مشتمل ہے۔ نوشہ محمد مرزا یکم مارچ ۱۹۱۷ء/۱۳۳۶ھ۔

اے زباں طبع سخن ساز کی جودت دکھلا — جس سے محظوظ ہوں سامع وہ فصاحت دکھلا
جمع ہیں کامل فن زور طبیعت دکھلا — شان مضموں کی دکھا نظم کی شوکت دکھلا
آفریں شیفتۂ خالق ذوالمجد کریں
وہ بلاغت ہو کہ سب اہل سخن وجد کریں

بس نفیسؔ آگے نہ لکھ حال حر نیک نہاد — جو زباں داں ہیں وہ بھولیں گے نہ ہرگز تیری یاد
کیا ضرورت جو کہیں یہ کہ ہمیں بھی ہے سواد — آپ کھل جاتی ہے سب وقت سخن استعداد
مشک و عنبر میں اگر بو ہے تو مشہور نہیں
خود ثنائی کبھی ہم لوگوں کا دستور نہیں

(۶) حضرت امام حسینؑ کے حال پر مشتمل ۱۰۹ بند ہیں:

کیا رتبہ جناب رسالتمآب ہے — ختم رسل جہاں کے رسولوں کا شاہ ہے
محبوب کبریا ہے فلک بارگاہ ہے — کرسی کے زیب زینت عرش الٰہ ہے
آدم سے پیشتر نہ کسی کا ظہور تھا
یا ذات کردگار تھی یا ان کا نور تھا

روک اے نفیسؔ تو سن خامہ کی اب عناں — دل میں کھٹک رہی ہے غم شاہ کی سناں
جاری ہے بحر فیض شہنشاہ دو جہاں — اس کے صلے میں پائے گا تو گلشن جناں
ذرہ نواز فاطمہؑ کا آفتاب ہے
مداح جو سخی ہے وہ کامیاب ہے

(۷) ۱۸۱ بند پر مشتمل حضرت قاسم کے حال پر مشتمل ناقص الآخر۔

ہاں اے عروس حجلۂ اعجاز رو دکھا — اے دوختہ مراد گل آرزو دکھا
اے لیلیٰ حجاب شب مشک بو دکھا — اے حور طبع طرۂ مرغولہ مُو دکھا

خوشبو ہو بزم رنگ زبان و دہن کھلے
تقسیم پھول ہوں در باغ سخن کھلے

دم تھا ہراس سے نہ جواں میں نہ پیر میں　　کس تھا کسی کماں میں نہ طاقت تھی تیر میں
جوہر عجب تھے تیغ تجلی نظیر میں　　پانی میں زہر آتش سوزاں خمیر میں
چھاتی جگر گلوں سے جو وہ جانگزا ملی
شبر کے زہر دینے کی آخر سزا ملی

(۸) یہ مرثیہ بھی حضرت قاسم کے حال پر مشتمل ۱۶۶ بند۔ مرقومہ ۱۱ر جولائی ۱۹۰۲ء، کاتب نواب مرزا غضنفر حسین خاں۔

ثنائے آل محمد ہے افتخار سخن　　اسی سے ہے شرف و رفعت و وقار سخن
یہی ہے باعث توقیر و اعتبار سخن　　یہی سخن کی ہے رونق یہی بہار سخن
زمیں کا رنگ فزوں تر چمن سے ہوتا ہے
سخن کا حسن حدیث حسن سے ہوتا ہے

یہ سن کے رانڈوں میں اک حشر ہوگیا برپا　　حسینؑ لے گئے لاشہ حرم سے دولھا کا
نفیسؔ بس کہ ہے مجلس میں شور آہ و بکا　　حسن کو دیتے ہیں قاسم کا پرسہ اہل عزا
شریک رونے میں حیدرؑ بھی ہیں رسول بھی ہیں
ملک بھی شبر و شبیر بھی بتول بھی ہیں

(۹) امام حسینؑ کے حال کا مرثیہ، جو ۱۶۰ بند پر مشتمل۔ اس کے ایک نسخے کا ذکر نمبر شمار ۳ پر کیا جا چکا ہے۔ اس نسخے کی کتابت بہتر ہے۔ مقطع پیش کیا جا رہا ہے:

پہونچے عراق میں جو ستارے حجاز کے
پھیلی ضیا قدم سے ہر اک سرفراز کے

بس اے نفیسؔ طول سخن اب نہیں ہے خوب　　اندھیر ہے کہ مہر امامت ہوا غروب
یارب اگرچہ مجھ میں ہیں سو طرح کے عیوب　　تو ساتر العیوب ہے اور غافر الذنوب
کس پر جہاں میں رحمت و لطف و عطا نہیں
تیرے کرم کا حصر نہیں انتہا نہیں

(۱۰) ۸۶ ویں بند سے مطلع ثانی شروع ہوتا ہے۔ جسے پیش کیا جا رہا ہے۔ ۲۱۸ بند پر مشتمل طویل مرثیہ جو امام کی مدینہ سے روانگی اور اہل حرم کی واپسی مدینہ پر مشتمل ہے۔ شروع کے چار بند کم ہیں۔ بند ۵ سے ۳۰ بند ناقص۔ کاتب آغا حسن۔

جب ہوا یوسف زہرا کا سفر یثرت سے　　چاند زہرا کا چلا وقت سحر یثرب سے
نکلے مغموم شہ جن و بشر یثرب سے　　ساتھ راہی ہوئے سب خویش و پسر یثرب سے
بعد ختم رسل تربت زہرا چھوٹی
گھر بزرگوں کا چھٹا فاطمہ کبریٰ چھوٹی

بند کے آخری مصرع میں فاطمہ صغریٰ ہونا چاہیے، جو کہ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے۔ اس مرثیہ کا مطلع ہے، ع- 'دشت غربت میں وطن سے شہ دیں جاتے ہیں' مقطع حسب ذیل ہے:

بس نفیسؔ اب کہ ہے مجلس میں بپا شیون و شین　　بات کی تاب نہیں سینے میں دل ہے بیچین
عرض کر شہ سے کہ اے ابن شہ بدر و حسنین　　ہو مری نظم بھی مقبول امام کونین
آبر خلق میں اے بہر عطا پاؤں میں
جلد اس اپنی مشقت کا صلہ پاؤں میں

(۱۱) ۱۴۳ بند پر مشتمل شہزادۂ حضرت علی اکبر کے حال پر مشتمل ہے۔ کاتب مرزا خادم حسین۔

ثنائے یوسف شبیر ہے جمال سخن　　عزیز جاں سے ہے یہ نظم بے مثال سخن
بڑھا ہے پھر شرف نیر کمال سخن　　دکھائے حسن نہ کیوں بدر بے زوال سخن

خجل ہے وقت رقم شمع طور کا جلوہ
وہ لفظ لفظ سے پیدا ہے نور کا جلوہ

اب آگے تاب بیاں کی نہیں خموش نفیسؔ — فغان و آہ کا مجلس میں ہے خروش نفیسؔ
نہیں غم شہ دیں میں کسی کو ہوش نفیسؔ — بکا کا ذاکر و سامع کو اک ہے جوش نفیسؔ
قیامت آ گئی لخت جگر کے مرنے سے
حسین ہو گئے تنہا پسر کے مرنے سے

(۱۲) مرثیہ 'بزم نفیسؔ' مطبع اثنا عشری دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ اس نسخے کے آخر میں نفیسؔ کا ایک سلام جس میں اٹھارہ اشعار ہیں، جس کا مطلع ہے:

مجرئی اس سے رضامند خدا کچھ بھی نہیں
جس کے دل میں شہ مرداں کی ولا کچھ بھی نہیں

مرثیہ کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے:

جب گیسوئے مشکیں کی گرہ شام نے کھولی — چہرے سے ردا لیلیٰ گلفام نے کھولی
شمشیر و سپر لشکر اسلام نے کھولی — خیمے میں کمر شاہ خوش انجام نے کھولی
سجدہ کیا زینب نے مصلیٰ کو بچھا کے
مغرب کی اذانیں ہوئیں لشکر میں خدا کے

خاموش نفیسؔ اب کہ تڑپتا ہے دل زار — مصروف ہیں ماتم میں شہ دیں کے عزادار
آقا سے یہ کر عرض کہ اے کل کے مددگار — ہے قیصر ساں قبلہ کونین کے سردار
دامن در مطلوب سے بھر دیجئے مولا
جس شے کا ہوں طالب وہ عطا کیجئے مولا

(۱۳) ۱۷۴ بند حضرت قاسم کے حال پر مشتمل مرثیہ تاریخ کتابت ۱۹۲۵ء بقلم مرزا

غضنفر حسین۔

پھر طبع سلیم انجمن آرائے سخن ہے — پھر دیدۂ دل عاشق سیمائے سخن ہے
پھر جلوہ کناں چہرۂ زیبائے سخن ہے — پھر مشک فشاں طرۂ لیلائے سخن ہے
لفظوں میں نظر آتا ہے پھر نور کا جلوہ
پھر حرف دکھاتے ہیں رخ حور کا جلوہ

خاموش نفیسؔ اب ہے دل پر غم جانکاہ — ہے سخت تر اندوہ غم قاسم نوشاہ
آقا سے یہ کر عرض کہ اے سید ذیجاہ — مقبول ہو سرکار میں یہ نظم ہوا خواہ
تم لخت جگر قاسم گلزار جناں ہو
خادم کا بھی ہمسایۂ حضرت میں مکاں ہو

(۱۴) 'روح سخن ثنائے حسین شہید ہے'۔ مسعود حسین رضوی ادیب کے نوٹ کے مطابق یہ مرثیہ مونسؔ کا ہے، جو ۱۸۸۰ء کا نوشتہ ہے۔

(۱۵) 'نور محمدی کا جہاں میں ظہور ہے'۔ درحال ولادت حضرت رسول خداؐ و ولی شدن جناب امیر علیہ السلام بر غدیر خم۔ مطلع کا دوسرا مصرع اس طرح ہے: 'جب حج آخری سے رسول خدا پھرے'۔ مخمس کی ہیئت میں ۹۶ بند میں مشتمل ہے۔

(۱۶) 'جب حضرت زینب کے پسر مر گئے دونوں' ۱۵۱ بند کا مرثیہ جو حضرات عون و محمد کے حال ہے، ادیب مرحوم کے مطابق یہ مرثیہ انیسؔ کا ہے جو بخط میر نفیسؔ ۱۳۲۲ھ کا نوشتہ ہے۔

(۱۷) ۳۳ بند پر مشتمل۔ شروع کے دو بند نہیں ہیں۔ مخطوطے کا ابتدائی بند اور مقطع درج ذیل ہے:

اب روئیں عزادار کہ حضرت کا بیاں ہے — اندوہ کا ماتم کا مصیبت کا بیاں ہے
آقائے دو عالم کی شہادت کا بیاں ہے — تھوڑا سا بہن بھائی کی رخصت کا بیاں ہے

سب روتے ہیں جب سرد نفس بھرتے ہیں شبیر
ہم شیر سے پوشاک طلب کرتے ہیں شبیر

خاموش نفیسؔ اب کہ نہیں تاب بیاں کی — آتی ہے صدا کانوں میں فریاد و فغاں کی
کر عرض یہ خدمت میں شہ کون و مکاں کی — مقبول کوئی بیت ہو اس ہیچ مداں کی

جز ذکر حضور اور کوئی ذکر نہ ہووے
اس فکر سوا مجھ کو کوئی فکر نہ ہووے

(۱۸) 'ثنائے یوسف شبیر ہے جمال سخن' - ناقص الآخر - ۴۱ بند موجود، دوسرے مکمل مرثیہ کا ذکر نمبر شمار ۱۱ پر کیا جا چکا ہے۔

(۱۹) ۳۹ بند پر مشتمل کسی مرثیہ کا جز معلوم ہوتا ہے، جس میں بعد شہادت شتر اسوار اور خط صغریٰ کا بیان ہے۔ مرثیہ کا ابتدائی بند اور مقطع درج ذیل ہے:

کیا رحم ہے حسین کے اس رحم کے نثار — غل سن کے الاماں کا ہوئے آپ بیقرار
گردن جھکائے روک لی مولا نے ذوالفقار — تھمنا تھا تیغ کا کہ چلے تیر دس ہزار

اک بیکس و غریب ہزاروں میں گھر گیا
زہرا کا پھول ظلم کے خاروں میں گھر گیا

بس اے نفیسؔ روک لے کلک گہر فشاں — تاراجی خیام کا آگے نہ کر بیاں
گو گوہر سخن کا نہیں کوئی قدر داں — شبیر موتیوں سے بھریں گے تری زباں

شہرہ جہاں میں کیوں نہ ہو تیرے کمال کا
تو مداح خواں ہے فاطمہؑ زہرا کے لال کا

(۲۰) ۱۷۱ بند پر مشتمل امام حسینؑ کے حال کا مرثیہ ہے:

برباد و کشور ہے کہ سلطاں نہیں جس میں — ہے خاک سے بدتر وہ جسد جاں نہیں جس میں
تیرہ ہے وہ دن نیر تاباں نہیں جس میں — افسردہ وہ صحبت ہے ثنا خواں نہیں جس میں

اللہ کے پیاروں کی جو توصیف نہیں ہے
رونق نہیں رقت نہیں تعریف نہیں ہے

خاموش نفیسؔ اب کہ جگر غم سے ہے صد چاک — گھر میں شہ مظلوم کے در آئے ہیں سفاک
لٹتے ہیں خیام پسر سید لولاک — شبیر کو رونے نہیں پائے حرم پاک

مختار جناں بیکس و ناچار ہوئے ہیں
زندان میں سجاد گرفتار ہوئے ہیں

(۲۱) ناقص الآخر کل ۸۳ بند حضرات عون و محمد کے حال پر مشتمل۔ ابتدائی بند:

کیا جگر بند شہنشاہ رسالت کو ملے — کیا خوش اقبال پسر خلق میں حضرت کو ملے
کیا ستارے قمر برج نبوت کو ملے — کیا نواسے بخدا مالک امت کو ملے

روز و شب اہل زمیں اہل فلک روتے ہیں
آج تک جن کو جن و انس و ملک روتے ہیں

(۲۲) مکمل ۱۸۱ بند پر مشتمل اس کا ایک نسخہ نمبر شمار ۲۱ پر موجود ہے۔ مقطع درج ذیل ہے، جس میں نفیسؔ نے تعلّی کا اظہار کیا ہے:

بس نفیسؔ اب کہ زباں کو نہیں یارائے کلام — نظم میں تیرے فصیحوں کے نہیں جائے کلام
بندش ایسی ہو تو پھر کیوں نہ شرف پائے کلام — نجم کی طرح چمکتے ہیں گہر ہائے کلام

ذکر ہر سو جو ترے نیر اقبال کا ہے
فیض یہ حیدر کرار کے دولال کا ہے

(۲۳) عنوان طراز، اس کا ایک نسخہ نمبر شمار ۳۴ پر موجود ہے۔ جہاں مطلع و مقطع پیش

کیا جائے گا، نسخہ کافی خستہ حالت میں ہے۔

(۲۴-الف) یہ مرثیہ حضرت علی اکبر کے حال کا ہے، جو ۸۵ بند پر مشتمل، ماہ ربیع الاول ۱۲۷۱ھ کا نوشتہ ہے۔

یعقوب مصطفیٰ سے جو یوسف جدا ہوا　　یعنی شہید اکبر گلگوں قبا ہوا
ناموس شہ میں شور قیامت بپا ہوا　　آفت میں فاطمہؑ کا پسر مبتلا ہوا
بہتا تھا خوں زمیں پہ تن پاش پاش سے
لپٹی ہوئی ہے اکبر مہرو کی لاش سے

بس اے نفیسؔ روک لے کلک گہر فشاں　　تاراجیٔ خیام کا آگے نہ کر بیاں
گو گوہر سخن کا نہیں کوئی قدر داں　　شبیر موتیوں سے بھریں گے ترا دہاں
شہرہ جہاں میں کیوں نہ ہو تیرے کمال کا
تو مدح خواں ہے فاطمہ زہرا کے لال کا

(۲۴-ب) یہ مرثیہ حضرت علی اکبر کے حال کا ہے، جو حدیقۂ ماتم ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۷ء میں مطبع اثنا عشری دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں نفیسؔ کا ایک اور مرثیہ بع-

'عباس کو جہاد کی جس دم رضا ملی' (۱۲۹ بند)　بھی شامل ہے۔

اس مے کا ہوں نوشندہ کہ مستی نہیں جس میں　　حاصل وہ بلندی ہے کہ پستی نہیں جس میں
آوارۂ صحرا ہوں کہ ہستی نہیں جس میں　　اس ملک میں بستا ہوں کہ بستی نہیں جس میں
رنجش نہیں کھٹکا نہیں آزار نہیں ہے
اس باغ کا بلبل ہوں جہاں خار نہیں ہے

یہ کہہ کے جو غش ہو گئے سجاد دل افگار　　سر ہاتھوں سے پٹتے حرم احمدؐ مختار
لاشے کو اٹھا لے گئے باہر شہ ابرار　　خاموش نفیسؔ آگے نہیں طاقت گفتار

سب پردہ نشیں چاک گریباں و حزیں تھے
مقتل سے پھرے جب تو اکیلے شہ دیں تھے

(۲۵) 'جب گیسوئے مشکیں کی گرہ شام نے کھولی' ۱۲۳ بند۔

(۲۶) 'ثنائے آل محمد ہے افتخار سخن' ۱۶۰ بند۔

(۲۷) 'طلوع ہوتا ہے پھر آج آفتاب سخن' ۱۳۶ بند۔

یہ تینوں مطبوعہ ہیں جو اس جلد میں شامل ہیں۔ یہ مراثی بزم نفیسؔ میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

(۲۸) حضرت امام حسینؑ کی شان میں ۱۵۶ بند پر مشتمل۔ کتابت ۱۴/ذی قعدہ ۱۳۴۲ھ۔

پھر آج جو ہر تیغ زباں دکھاتا ہوں　　پھر آج حسن معانی بیاں دکھاتا ہوں
پھر آج خوبی طبع رواں دکھاتا ہوں　　پھر آج نظم فصاحت نشاں دکھاتا ہوں
سخن کو پھر گل جنت کا رنگ ملتا ہے
پھر آج باغ ثنائے حسین کھلتا ہے

ادھر تو خانہ دیں کا چراغ ہو گیا گل　　حرم سے نکلے ادھر اہلبیت ختم رسل
نفیسؔ بس کہ ہے آہ و بکا کا بزم میں غل　　چلے ہیں لاش پہ ناموس قبلہ جزو و کل
کھلے ہیں بال گریبان چاک ہیں سب کے
کلیجے پھٹتے ہیں سن سن کے بین ان سب کے

(۲۹) حضرت قاسم کے حال پر مشتمل ۱۴۷ بند ہیں۔

خاندان شہ لولاک کا مداح ہوں میں　　جو ضیا بزم سخن کی ہے وہ مصباح ہوں میں
دشت وصف اسد اللہ کا سیاح ہوں میں　　اوج میں بوذرؓ و سلمانؓ و طرماحؓ ہوں میں

پایۂ چرخ بریں پست ہے پائے سے مرے
سوسعادت کے ہما بنتی ہے سائے سے مرے

فرش خامہ کے اب تو بھی عناں تھام نفیسؔ — رونے سے مجلس و ماتم میں ہے کہرام نفیسؔ
ہوا مداحوں میں سرور کے ترا نام نفیسؔ — کر دعا حق سے یہ رو کر سحر و شام نفیسؔ
جیتے جی بس اسی غم میں مجھے دن رات کٹے
ابن زہرا ہی کی مداحی میں دن رات کٹے

(۳۰-الف) ۹۱ بند پر مشتمل امام حسینؑ کے حال کا مرثیہ ہے۔

تسبیح فاطمہؑ کے جو دانے بکھر گئے — تنہا رہے حسین نمازی گذر گئے
پیرو امام پاک کے سب کوچ کر گئے — باہم تھا جن سے رشتۂ الفت وہ مر گئے
سوداغ اور ایک دل حق شناس تھا
کوئی نہ وقت ظہر نمازی کے پاس تھا

اب اے نفیسؔ لاش پہ زینب کے بین ہیں — جنگل کی دھوپ اور شہ مشرقین ہیں
یہ اشک ماتم شہ دیں نور عین ہیں — گھبرا نہ اس قدر ترے حامی حسینؑ ہیں
مذہب میں عاشقوں کے شکایت گناہ ہے
دولت یہ کم ہے کچھ کہ ثنا خوان شاہ ہے

(۳۰-ب) 'کیا جگر بند شہنشاہ رسالت کو ملے' ۱۸۱ بند مکمل بہتر حالت میں نسخہ ہے، جس کے دو نسخے اس جلد میں نمبر شمار ۲۱، ۲۲ پر موجود ہیں۔

(۳۱) ۷۹ بند پر مشتمل۔ نوشتہ ۲۵ رصفر ۱۲۹۴ھ نسخہ نامکمل معلوم ہوتا ہے۔

ہاں بوستان نظم دکھا پھر بہار نظم — غواص فکر لا گہر آبدار نظم
کوثر پہ آبرو میں بڑے جو بہار نظم — خیاط عدن ہو چمن لالہ زار نظم

وہ گل کھلیں کہ تختہ کاغذ ارم بنے
منقار عندلیب زباں سے قلم بنے

(۳۲) اس کا مطلع 'جب گیسوئے مشکیں کی گرہ شام نے کھولی' ہے۔ اس نسخے میں شروع کے ۱۵ر بند نہیں ہیں۔ مقطع کا آخری مصرع اس طرح ہے۔ ع- میں جس کا ہوں طاب وہ عطا کیجئے مولا۔

(۳۳) یہ مرثیہ حضرت اکبر کے حال پر مشتمل ہے، جس میں ۱۴۵ بند ہیں۔

عنواں طراز نامہ نو ہے زباں مری — صورت نگار حسن ہے فکر جواں مری
معیار نقد شعر ہے طرز بیاں مری — غواص بحر نظم ہے طبع رواں مری
ایسے کسے جہان میں بخت رسا ملے
قسمت سے جب ملے تو در بے بہا ملے

بس اے نفیسؔ سینہ میں صد چاک ہے جگر — دشمن کو دے نہ خالق اکبر غم پسر
حق سے دعا یہ مانگ کہ اے رب بحر و بر — عمر دو روزہ یہ اسی ماتم میں ہو بسر
نظم سخن کی فکر رہے جستجو رہے
صدقہ میں شہ کے نام رہے آبرو رہے

(۳۴) ۱۳۷ بند پر مشتمل امام حسین و انصاران امام کے حال پر مشتمل۔ نسخہ کی حالت بہتر ہے۔

باندھی کمر جو فوج خدا نے جہاد پر — چھایا ہراس لشکر ابن زیاد پر
طاری تھا غیظ شہ کے ہر اک خانہ زاد پر — جرأت فدا تھی فوج عقیدت نہاد پر
قبضوں کو چومتے تھے شجاعت کے جوش میں
جرار جھومتے تھے شجاعت کے جوش میں

بس اے نفیسؔ مرثیہ ہوتا ہے اب طویل　　مصرع ہیں لاجواب تو مضمون بے عدیل
اس مدح کو قبول کریں سید جلیل　　مداح جن کا تو ہے وہی ہیں ترے کفیل
مقبول بارگاہ خدائے قدیر ہیں
شاہان خلق سب اسی در کے فقیر ہیں

(۳۵)اس مرثیہ کے صرف ابتدائی چار بند ہیں جنہیں ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

پھر بہار آئی گلستان سخن کھلتا ہے　　جس میں سب پھول نئے ہیں وہ چمن کھلتا ہے
باغ اوصاف شہنشاہ زمن کھلتا ہے　　گلشن تازۂ افعال حسن کھلتا ہے
رنگ و بو میں ہیں خجل گلشن رخسار کے پھول
باغ عالم کا ہے طرہ مرے گلزار کے پھول

پھر چمن زار سخن تازہ و تر ہوتا ہے　　پھر دم فکر رواں خون جگر ہوتا ہے
پھر ادھ فصل بہاری کا گذر ہوتا ہے　　پھر عیاں نخل فصاحت میں ثمر ہوتا ہے
گلشن نظم کو پیراستہ کرتا ہوں میں
اک نیا باغ پھر آراستہ کرتا ہوں میں

پھر مہکتے ہیں گل طبع سلیم ان روزوں　　گلشن خلد کی آتی ہے نسیم ان روزوں
غنچۂ خلد کی پھیلی ہے شمیم ان روزوں　　دل کو اس باغ کا ہے شوق عظیم ان روزوں
ذہن یوں سیر گلستان سخن کرتا ہے
جس طرح سے کوئی گلگشت چمن کرتا ہے

بلبل حسن ہے پھر نغمہ سرا رہ رہ کر　　خوش ہوں چلتی ہے مسرت کی ہوا رہ رہ کر
وجد کرتی ہے مری طبع رسا رہ رہ کر　　بڑھتی ہے گلشن مضموں کی فزا رہ رہ کر

لالہ زار اک دل پر داغ نظر آتا ہے
جس طرف دیکھتا ہوں باغ نظر آتا ہے

(۳۶)۹۵ بند پر مشتمل حضرت علیؑ کے حال کا مرثیہ ہے، جو نامکمل معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مطلع اور آخری بند پیش کیا جارہا ہے۔

ہے غازۂ عذار سخن مرتضٰی کی مدح　　زیبائش کلام ہے مشکل کشا کی مدح
مصباح بزم نور ہے دست خدا کی مدح　　آرائش بیاں ہے شہ لافتیٰ کی مدح
ان کا کلام دونوں جہاں میں سعید ہے
حب علیؑ بہشت بریں کی کلید ہے

زخمی پدر کو لائے جو گھر میں علی کے لال　　زہرا کی بیٹیوں نے کیا غیر اپنا حال
غل تھا کہ ہائے قبلۂ دیں شیر ذوالجلال　　چلاتی تھی یہ زینب مضطر بصد ملال
کس نے یہ تیغ سر پہ علیؑ کے لگائی ہے
زخمی ہوا وصی محمدؐ دہائی ہے

اس کے علاوہ بیاض نمبر ۲۵-U-633 اس کے علاوہ ذخیرۂ ادیب میں درج ذیل سلام موجود ہے، جس کا مطلع اور مقطع پیش کیا جارہا ہے۔

مجرئی شاہ کا جب حلق کٹا خنجر سے　　شیر زہرا کا لہو ہو کے بہا خنجر سے
تیغ غم کیوں نہ چلے دل پہ محبوں کے نفیسؔ　　ذبح سرور ہوئے بے جرم و خطا خنجر سے

ذخیرۂ ادیب میں بیاض ۵۲-U-660 پر بھی ایک سلام موجود ہے، جس کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے:

رہتی ہے کتاب غم سرور مرے آگے　　اے مجرئی واخلد کا ہے در مرے آگے
شاہنشہ اقلیم سخن ہوں میں نفیسؔ اب　　صف بستہ مضامیں کا ہے لشکر مرے آگے

زیرِ نظر سطور میں ایک طرف مرزا جعفر حسین کی نفیسؔ کے حوالے سے ناقدانہ تحریر پر گفتگو کی گئی ہے تو دوسری طرف مرثیہ کے محقق اعظم سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کے ذخیرۂ مراثی سے نفیسؔ کے مرثیوں کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ نفیسؔ کے ناقدین و محققین نفیسؔ کے کلام تک آسانی سے پہنچ جائیں اور نفیسؔ جیسے قادر الکلام شاعر کے فن پر کما حقہ گفتگو کی جاسکے۔ ہمارے بزرگوں نے مرثیوں کی نگہداشت اور جمع آوری پر خاطر خواہ دھیان دیا تھا اور آج بھی لائبریریوں، ذاتی کتب خانوں اور بستوں میں بہت سے مراثی محفوظ ہیں اور محققین و ناقدین سے توجہ کے طالب ہیں۔ آج جب کہ بہت سے نام نہاد محققین و ناقدین جان بوجھ کر رثائی ادب کی فنی عظمتوں کے منکر ہو رہے ہیں حالانکہ فنی اعتبار سے بقول حالیؔ اور شبلیؔ کے اردو میں کوئی صنف اس پایہ کی نہیں ہے لیکن یہ نام نہاد ناقدین ادب حالیؔ اور شبلیؔ کی عظمتوں کے تو قائل ہیں لیکن مرثیہ کو مذہبی شاعری کہہ کر نئی نسل کو گمراہ کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مرثیہ کی فنی لطافتوں کو پرکھا اور جانچا جائے اور اسے اس کا جائز مقام دلایا جائے۔

○○○

حواشی:

(۱) بیسویں صدی اور جدید مرثیہ: ڈاکٹر ہلال نقوی، کراچی ۱۹۹۴ء، ص-۵۷۱

(۲) اسلاف و اخلاف میر انیسؔ مولفہ: سید محمد عباس آصف، مرتبہ سید علی احمد دانش، ڈائمنڈ پریس لکھنؤ، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص-۲۷۶

(۳) ایضاً، ص-۲۷۶

(۴) تجلیات اسم تاریخی تاریخ عباس: عزیزؔ لکھنوی، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۳۴۴ھ، ص-۳۷۸

(۵) بحوالہ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، ص-۸۱

(۶) قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، مرزا جعفر حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص-۲۸۸

(۷) ایضاً، ص-۲۹۱

(۸) ایضاً، ص-۲۹۲، ۲۹۱

(۹) ایضاً، ص-۲۹۲

(۱۰) ایضاً، ص-۲۹۳

(۱۱) ایضاً، ص-۲۹۳

(۱۲) ایضاً، ص-۲۹۵

(۱۳) ایضاً، ص-۲۹۶

(۱۴) ایضاً، ص-۲۹۸، ۲۹۷

(۱۵) جواہر شمارہ ۲، ۳ (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء و اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴ء) مدیر ارتضیٰ عباس نقوی، کراچی پاکستان۔

(۱۶) فہرست مخطوطات، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ (ذخیرۂ ادیب مرحوم UN-567)

(۱۷) ایضاً UN-579)

(۱۸) ایضاً UN-585)

(۱۹) ایضاً UN-633)

(۲۰) ایضاً UN-660)

منبر انتقاد کا خطیب اعظم انیسؔ شناس

نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی

انیسؔ و دبیرؔ کے عہد مرثیہ گوئی کی سب سے نمایاں خوبی یہ تھی کہ مرثیہ اس عہد میں محض مرثیے کی تاریخ میں نہیں بلکہ شاعری اور ادب کی تاریخ میں موضوع بحث بن گیا۔ اس کے مدہم نقوش تو سوداؔ اور میرؔ ہی کے زمانے میں ابھرے لیکن انیسؔ کے قلم نے تو دنیا ہی بدل دی۔ محمد حسین آزاد، حالیؔ اور شبلیؔ جیسے ناقدین ادب نے بہت سنجیدگی سے اس صنف سخن پر توجہ کی۔ خصوصاً شبلیؔ نے تو ''موازنۂ انیس و دبیرؔ'' لکھ کر کلاسیکی مرثیے کے تعلق سے افکار و مباحث کے دروازے کھول دیئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مرثیے کی تنقیدی تاریخ شبلیؔ کے نام سے عبارت ہے۔ جس طرح کلاسیکی مرثیے کی تاریخ میں انیسؔ کا نام سب سے اہم ہے۔ اسی طرح شبلیؔ اور ان کا موازنہ تمام تر اختلافات کے باوجود آج بھی مرثیے کی تنقیدی تاریخ میں سرفہرست ہے۔ موازنے کی اشاعت کو ایک صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج تک جتنی تحریریں اور کتابیں اسکی رد میں آئی ہیں اتنی شاید ہی کسی تنقیدی کتاب کے مقابلے میں آئی ہو۔ اور فوق کی ''المیزان'' اور افضل علی صبوؔ کی ''ردالموازنہ'' سے لیکر صدہا مقالے، مضامین اور تحریریں ہیں جن میں بحث و تنقید کا یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

اس حقیقت سے تو انیسؔ کا سب سے بڑا حامی بھی منکر نہیں ہوگا کہ دبیرؔ کے

اسلوب، آہنگ لہجے اور ان کے مصرعہ کی ساخت کا طرز اردو شاعری کی تاریخ میں ایک ایسے اسکول کو باقاعدہ قائم کرتا ہے جس کی ابتدا ناسخؔ سے ہوئی۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب محض شاعرانہ زاویوں سے اور نفسیاتی جہتوں سے پرکھنے کا عمل شروع ہوگا تو انیسؔ کی دراز قامتی کی طرف نگاہ خود بخود اٹھے گی۔ شبلیؔ یقیناً موازنے میں کئی مقامات پر اعتدال سے باہر آ گئے ہیں اور یہ بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کا قلم انیسؔ کے تذکرے میں زیادہ تیز چلنے لگتا ہے۔ مگر مباحث کی ان جزئیات سے قطع نظر موازنہ کے اس کلی مزاج کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے جس میں مصنف کے شاعرانہ نقطۂ نگاہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ:

> ''شبلیؔ اردو کے سب سے بڑے مرثیہ نگار شاعر کی شاعری کو جن شعری حسیّات کی روشنی میں دیکھ رہے تھے اسکی طرف لکھنے والوں کی نظریں کم گئی ہیں''[1]

جبکہ ڈاکٹر احسن فاروقی بہت تیور کے ساتھ یہ بات کہتے ہیں:

> ''اگر اردو ادب کے دلدادہ طبقے کے مذاق سلیم کی اصلاح کرنا ہے تو موازنہ کی عمارت کو بالکل ڈھا کر دوسری عمارت بنانے کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے''[2]

دراصل اس قسم کی الجھنیں ناقدوں میں وہاں پیدا ہو گئیں ہیں جہاں وہ مرثیہ نگار کو مورخ، محض واقعہ نویس اور محض مرثیہ گو یا ذاکر امام کی حیثیت میں دیکھتے ہیں یا دیکھنا چاہتے ہیں اور اسکے شاعر ہونے کو بھول جاتے ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی بھی ایسے ہی ناقد ہیں جو ادبی الجھن کا شکار ہیں اور انہوں نے ''انیسؔ کی مرثیہ نگاری'' کے عنوان سے ''رسالہ نگار'' لکھنؤ میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا جس کا جواب نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی نے نگار ہی میں

شائع کیا جو بعد میں دانش محل لکھنؤ سے پہلی بار مارچ ۱۹۵۱ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔

نواب جعفر علی اثرؔ لکھنوی مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی کے قابل ناز شاگرد اور بقول جوشؔ مرحوم:

''علم عروض وفّن شاعری کے مرکزی استاد، فارسی وانگریزی ادب کے زبردست نباض تھے''۳۔

اثرؔ لکھنوی کو بچپن ہی سے مرثیہ سے لگاؤ رہا اور ان کا شعری ذوق دیگر اصناف سخن سے زیادہ مرثیہ کی طرف راغب رہا۔ جوشؔ نے انہیں ''منبر انتقاد کا خطیب اعظم، مسند زبان کے قاضی القضات اور مدینۂ تہذیب لکھنؤ کا طاق زریں''۴ لکھا ہے۔ اردو مرثیے کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی اور اسکی فنی باریکیوں سے کماحقہٗ واقف تھے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے جب ''اردو مرثیہ اور انیسؔ'' لکھی اور میر انیسؔ پر اعتراضات کیے تو اس کے جواب میں پہلی کتاب اثرؔ لکھنوی نے لکھی جس کا نام ''انیسؔ کی مرثیہ نگاری'' تھا۔ اس کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد ناقدین ادب نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ''انیسؔ کی مرثیہ نگاری'' تنقید کی ایک جامع کتاب ہے جس میں میر انیسؔ پر اعتراضات کا جواب بھی ہے اور ان کے فن پر بے لاگ مثبت تنقیدی تبصرہ بھی۔ پروفیسر احتشام حسین اس کتاب کے متعلق فرماتے ہیں:

''یہ کتاب مرثیہ کی خصوصیات، میر انیسؔ کے کمال شاعری اور مرثیہ کے متعلق بعض غلط فہمیوں اور اعتراضوں کے جواب پر مشتمل ہے''۔۵

عرشؔ ملسیانی کی رائے کچھ اس طرح کی ہے:

''علمی مذاق رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب قابل مطالعہ چیز ہے

''۶

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی اثرؔ کی زباندانی کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

''اردو زبان کے الفاظ ومحاورات کی جو پرکھ ان کو تھی وہ بہت کم لوگوں کو تھی''۷

مگر وہ محض لطف زباں ہی کو شاعری قرار نہیں دیتے۔ انہوں نے اپنے ایک شعر میں اس کا اظہار بھی کیا ہے:

شاعری لطف زباں تک نہیں محدود اثرؔ
ساتھ ہی ساتھ فراوانی جذبات بھی ہو

اثرؔ کا مرثیہ ''آئینہ شہادت'' فراوانی جذبات ہی کی ایک تصویر ہے جس میں طرز فکر کے نئے زاویے ابھرتے نظر آتے ہیں:

اللہ رے شوق رخ گلفام شہادت
پیہم لب جاں بخش پہ تھا نام شہادت
محبوب کا پیغام تھا پیغام شہادت
پھر کیوں نہ ہو اس شان سے انجام شہادت

قاتل کا اگر ہاتھ رکا آنکھ بھر آئی
خنجر نے کمی کی تو رگ جاں ابھر آئی

اے جان و فا معنی و تفسیر شہادت
ہر قطرۂ خوں ہے ترا تنو یر شہادت
جاگی ہے ترے فیض سے تقدیر شہادت
گزری ہے سر عرش سے توقیر شہادت

مشہور جہاں حسن گلو سوز ہے تیرا
اے شمع حرم! شعلہ دل افروز ہے تیرا [۸]

جس زمانے میں انہوں نے آئینہ شہادت لکھا اسی زمانے میں نسیم امروہوی نے اپنا مرثیہ ''سازحریت'' لکھا جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

حسین پیکر انسانیت کی جاں تو ہے
زمین صبر و تحمل کا آسماں تو ہے
نہ صرف دین محمدؐ کی عزو شاں تو ہے
رہ حیات میں سالار کا رواں تو ہے
جہاں کو خواب فنا سے جگا دیا تو نے
بقا کے واسطے مرنا سکھا دیا تو نے

زہے یہ جذبۂ ہمت یہ ذوق بیداری
نہ ہونے دی بشریت کی ذلت وخواری
چلا جورن کو سجا کر سلاح خودداری
سپاہ شام کی تیغوں کو کر دیا عاری
جتا دیا کہ اجل حریت کا زیور ہے
دکھا دیا کہ غلامی سے موت بہتر ہے [۹]

جعفر علی خاں اثرؔ نے اس مرثیے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''مرثیہ کو اگر زندہ رکھنا ہے تو زمانے کے ساتھ اسکا بھی رنگ بدلنا ہوگا اور بجائے واقعات کے فلسفۂ واقعات بیان کرنے کی ضرورت روز بروز زیادہ شدت سے محسوس ہوگی۔ کربلا کے عظیم

الشان کارناموں کا مرکز ثقل بدل جائے گا۔ حسینؑ کی مظلومی اور بیکسی کا افسانہ سنا کر رونے اور رلانے کا مقصد پیش پیش نہ رہے گا، بلکہ اس امر پر زور دینا ہوگا کہ اس دلبند رسولؐ نے حق کی حمایت میں سب کچھ قربان کر دیا اور اس طرح صرف اسلام کو نہیں بلکہ انسانیت کو فنا ہونے سے بچالیا۔ اس خیال میں بھی انقلاب پیدا کرنا ہوگا کہ یہ جو کچھ ہوا ''امت گناہ گار'' کی بخشش کے لیے ہوا، نہیں بلکہ باطل کا سر کچل دیا گیا، انسانیت کو لافانی سبق ملا، ہر طبقہ اور ہر عمر اور ہر ملت کے افراد کے لیے ایک بے مثل دستور العمل مرتب ہوا۔ کربلا کا ہر واقعہ، ہر ایثار مکمل انسانوں کا ایسا دلکش مرقع ہے جس کے نقش ونگار ابدالآباد تک اجاگر رہیں گے'' [۱۰]

مرثیے کی روایتی شاعری کو ایک نئے مزاج میں ڈھالنے کی شعوری کاوشوں کا اظہار اثرؔ لکھنوی کی درج بالا رائے سے ظاہر ہے۔ بقول ڈاکٹر ہلال نقوی:

''یہ وہی دور ہے جب لکھنؤ کی روایتی شاعری کو ایک نیا موڑ دینے کی کوشش ادبی سطح پر کی جارہی تھی'' [۱۱]

نواب جعفر علی خاں اثرؔ مرثیے کے معتبر قاری بھی ہیں اور دیدہ ور ناقد بھی۔ انہوں نے جہاں ''آئینہ شہادت'' لکھ کر مرثیے میں جدت کو فروغ دیا وہیں مرثیہ اور انیسؔ پر جب ڈاکٹر احسن فاروقی جیسے انیس ناشناس نے مضامین کا سلسلہ شروع کیا تو اس کا مثبت اور مدلل جواب بھی دیا۔ ذیل میں فاروقی صاحب کے کچھ اعتراضات کی نشاندہی کی جارہی ہے اور جعفر علی خاں اثرؔ نے جو جواب دیا ہے اسے بھی معروضی نقطۂ نظر سے پیش کیا جارہا ہے۔

فاروقی صاحب فرماتے ہیں:

''اردو ادب کی سب سے طبعزاد اور غیر تقلیدی صنف مرثیہ ہے''

جعفر علی خاں اثرؔ درج بالا عبارت کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''ان کا یہ ادعا درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ضمیرؔ سے پیشتر اردو میں جس طرح کا مرثیہ رائج تھا وہ ہو بہو فارسی کی نقل تھی اور اس میں صرف شہدائے کربلا کے مصائب کا تذکرہ ہوتا تھا۔ مراثی بالعموم شاعرانہ خوبیوں اور جوش وخروش سے خالی ہوتے تھے۔ اول اول سوداؔ نے مرثیہ میں کہیں شعریت پیدا کی۔ اس کے یہ چار مصرعے آج بھی تاثیر سے لبریز ہیں:

یارو سنو تو خالق اکبر کے واسطے
انصاف سے جواب دو حیدر کے واسطے
وہ بوسہ گہ بنی تھی پیمبرؐ کے واسطے
یا ظالموں کی برش خنجر کے واسطے

قدیم مرثیہ گویوں میں ایک میاں سکندر تھے، ان کا ایک مرثیہ:

''ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول''

پیکر سوز و گداز ہے اور کچھ برس ادھر اتنا مقبول تھا کہ فقیر اسے پڑھتے ہوئے پھیری لگاتے تھے۔ جہاں تک تحقیق ہو سکا ہے سوداؔ ہی پہلا شاعر تھا جس نے صنف مسدس میں مرثیہ کہا اور اب یہ امر قریب قریب مسلم ہے کہ مرثیہ کہنے کیلئے اس سے زیادہ مناسب اور جولانی طبع دکھانے کیلئے وسیع ترین امکانات مہیا کرنیوالی کوئی دوسری صنف نہیں'' ۱۲؎

فاروقی صاحب مرثیے کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ مرثیہ ایسی صنف ادب ہے جو عربی و فارسی کیا یورپ وایشیا کے کسی ادب میں نہیں ملتی۔ عام طور پر نقاد مرثیہ کے لغوی معنی لے کر ان نظموں کو مرثیہ کہہ دیتے ہیں جو دنیا کے شاعروں نے اپنے دوست عزیز یا کسی بڑے آدمی کے بچھڑ جانے پر لکھی ہیں۔ نیز شبلی پر یہ اعتراض وارد کر دیتے ہیں:

''اس غلطی کی ابتدا مولانا شبلی نے کی اور اسکے بعد عام ہو گئی حالانکہ ان نظموں کا ہمارے مرثیے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظمیں ذاتی جذبات کا اظہار کرتی ہیں اس لیے ان کا تعلق غنائی یا داخلی شاعری سے ہے اور مرثیہ چونکہ پوری قوم کے مذہبی جذبات کا آئینہ دار ہے اس لیے اسکی نوعیت بالکل جدا ہے اور خارجی شاعری سے تعلق رکھتی ہے''۔

جعفر علی خاں اثرؔ نے شبلی کا دفاع کیا:

''حیرت ہوتی ہے کہ مولانا شبلی مرحوم انگریزی کے عالم نہ ہونے کے باوجود کس قدر باخبر اور ادب کے کیسے زبردست نباض تھے اور فاروقی صاحب لکھنو یونیورسٹی کے استاد انگریزی مغربی ادبیات سے عدم واقفیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ مولانا شبلی جو برسوں ادھر فرما گئے وہ آج بھی یورپ میں سکہ رائج الوقت ہے۔ یورپین ناقدین نے جہاں شاعری کو داخلی اور خارجی اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ یہ شرط بھی لگا دی ہے کہ یہ تقسیم محض برائے امتیاز ہے ورنہ عام طور پر اور بالخصوص جدید شاعری میں شخصی یا داخلی اور غیر شخصی یا خارجی شاعری کے عناصر گھل مل جاتے ہیں'' ۱۳؎

اس کے بعد آثر نے مغربی شاعری کی متعدد مثالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ غنائی شاعری کا دائرہ داخلی شاعری تک محدود نہیں بلکہ وسیع تر ہے۔ آثر نے فاروقی صاحب کی عبارت کو جسے انہوں نے ارسطو سے منسوب کیا ہے مبہم اور ناتمام بتایا ہے فاروقی صاحب کی عبارت درج ذیل ہے:

''ڈرامہ ایپک خوف کے جذبات کو دور کرتے ہیں''

آثر نے یہ ثابت کیا ہے کہ فاروقی صاحب نے جس عبارت ناتمام کو نقل کیا ہے وہ ایپک سے نہیں بلکہ ٹریجڈی سے متعلق ہے اور جہاں تک ڈرامہ کا تعلق ہے اس کا اطلاق کامیڈی اور ٹریجڈی دونوں پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ کامیڈی کو رحم یا خوف کے جذبات سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ ارسطو کی عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ ٹریجڈی رحم اور دہشت کے جذبات کو ابھار کر ان جذبات (یعنی جذبات رحم و دہشت) کی اصلاح تہذیب کرتی ہے۔

انگریزی عبارت یہ ہے:

(TRAGEDY EFFECTING THROUGH PITY AND HORROR THE CORRECTION AND REFINE OF SUCH PASSIONS)

یہ ضرور ہے کہ مرثیہ اپنی ابتدائی شکل میں سیدھی سادی ایلیجی (ELEGY) تھا لیکن انیس و دبیر نے اس کو مرتفع کر کے ٹریجڈی اور ایپک شاعری کا (وسیع ترین یونانی مفہوم میں) رتبہ دے دیا۔

فاروقی صاحب مرثیہ کے تعلق سے ایک جگہ فرماتے ہیں:

''مرثیہ بنیادی طور پر ادبی چیز ہے بھی نہیں۔ اول اول اس میں ادبی عناصر اضافہ کرنے کا خیال میر ضمیر کو پیدا ہوا لیکن ان کے ادراک کا رجحان زیادہ تر مبالغہ کی طرف ہے اس لئے مرثیہ میں

بھی یہی رنگ غالب رہا اور میر ضمیر نے تمام اصناف سخن کو مرثیہ میں کھپا کر مرثیہ کو ایک نئی صنف بنا دی''۔

فاروقی صاحب نے ابتدا میں یہ کہا ہے کہ ''اردو ادب کی سب سے زیادہ طبع زاد اور غیر تقلیدی صنف مرثیہ ہے لفظ 'بنیادی' میں فاروقی صاحب نے جو کچھ معنویت بند کی ہو بظاہر دونوں اقوال میں تضاد ہے۔

آثر درج بالا عبارت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''جب وہ میر انیس کے مرثیہ کو مرثیہ ہی نہیں سمجھتے تو ہمیں یہ سوال اٹھانے کا حق ہے کہ پھر میر انیس کے مفروضہ یا نام نہاد مرثیہ کو کس صنفِ ادب میں جگہ دیتے ہیں۔ میں نے تو آج تک ایسی کوئی نظم نہیں دیکھی جس کی صنف کا تعین نہ ہو سکے۔ یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ انیس کے مرثیہ میں دیگر اصناف شاعری مثنوی، قصیدہ وغیرہ کے عناصر سموئے ہوئے ہیں''[۱۴]

فاروقی صاحب نے مرثیہ کے ساتھ ساتھ مجلس کے تعلق سے بھی اظہار خیال کیا:

''مجلس عام طور پر اس لیے برپا کی جاتی تھی کہ امام حسینؑ کی درد ناک شہادت کا بیان کیا جائے''۔

جعفر علی خاں آثر فاروقی صاحب کے اس قول سے متفق نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں:

''مجلس کا منشاء صرف یہی نہیں ہوتا تھا بلکہ امام حسینؑ اور ان کے اعزا و رفقاء و اہلبیت کے کردار کی مصوری بھی ہوتی تھی۔ ان کے فضائل و مکارم اخلاق بھی بیان کیے جاتے تھے اور خاتمہ کسی درد ناک واقعہ پر ہوتا تھا جس کا مبکی ہونا قدرتاً لازم تھا۔ مرثیہ خوانی کا

مقصد میر انیسؔ نے ایک بیت میں نظم کر دیا ہے:

دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

انیس کے بیان کردہ مندرجہ بالا خصوصیات کا اعتراف کلیم الدین احمد نے بھی کیا:

''انیس میں کچھ خوبیاں ہیں جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔

وہ جانتے ہیں کہ:

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

وہ اپنے مرثیوں میں تنوع پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

دبدبہ، مصائب، توصیف سب چیزیں موجود ہیں''۔

جس کا نتیجہ ہے کہ انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیوں نے زبان اردو کو اس بلندی پر پہونچا دیا کہ اردو ادب دنیا کی کسی زبان کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے بقول حالیؔ:

اردو گو راج چار سو تیرا ہے
ملکوں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تلک انیسؔ کا سخن باقی ہے
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

فاروقی صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''مرثیہ گو کیلئے یہ ضروری ٹھہرتا ہے کہ وہ امام علیہ السلام اور ان کے انصار کے واقعات جرأت و اخلاق سے زیادہ ان کی مظلومی پر زور دے اور امام کی بابت وہی باتیں بیان کی جائیں جو ان کی بیکسی اور بے چارگی کو ظاہر کرتی ہیں۔''

اس عبارت کے متعلق اثر فرماتے ہیں:

''فاروقی صاحب کو اعتراف ہے کہ 'واقعات ہی ایسے ہیں جن کو سن کر رقیق القلب انسان کو رونا آجاتا ہے'۔ جسے وہ عیب سمجھتے ہیں دراصل انیسؔ کے آرٹ کا کمال ہے۔ وہ مورخ نہیں شاعر تھے جو کربلا کے خونی منظر کے مرقع تیار کر رہے تھے۔ لہٰذا اپنی خداداد قابلیت اور ذکاوت کی رہنمائی میں واقعات کے انہیں پہلوؤں کو اجاگر کیا جس سے اس ٹریجڈی کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگے اور حمایت حق میں بلا تامل اور بے دریغ جانبازی اور سرفروشی کا جذبہ انگیز ہو''۔۱۵

آثرؔ کی تائید علی جواد زیدی نے بھی کی ہے:

''انیسؔ یقیناً تاریخی مواد پر کام کر رہے تھے لیکن ہمیں یہ تو محسوس کرنا ہی ہوگا کہ وہ نہ تو تاریخ لکھ رہے تھے اور نہ سوانح عمری۔ انہوں نے اسکی کوشش کی ہے کہ عرب پس منظر میں اخلاقی آفاقیت کی تخلیق جدید کریں اور اس طرح سے کریں کہ وہ مفروضہ حد بندیوں کو پار کر سکے اور فوق تجرباتی ہو۔ اس عمل میں انہوں نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ وہ روایت کے نرے مقلد ہوں''۔۱۶

آثرؔ اور علی جواد زیدی کی تائید میں انیسؔ کے مرثیہ:

جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا

کو پیش کیا جا سکتا ہے جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جن کردار و واقعات کو پیش کیا ہے وہ فرضی نہیں تھے اور نفس واقعہ حقیقتاً وقوع میں آیا تھا لیکن انہوں نے واقعہ کو

محض موزوں کلام میں پیش نہیں کیا جو تاریخ کی حیثیت ہوتی ہے بلکہ واقعات سے ایک پلاٹ مرتب کیا اور جب انہوں نے خالص تاریخی واقعات بیان کیے تب بھی انداز بیان میں قرین قیاس اور لازمی نتیجے کو ملحوظ خاطر رکھا۔ اس لیے قاری کو دلچسپی اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں انیسؔ مورخ سے الگ ہو کر شاعر ہو جاتے ہیں۔ پورے مرثیہ میں واقعات میں تسلسل اور کرداروں میں یکرنگی قائم ہے۔ واقعات گو المیہ ہیں لیکن ان میں کشش ہے مثال کے طور پر حضرت عباس پیاسے ہیں اور دریا میں گھوڑا ڈالے ہوئے ہیں وہ آل محمدؐ کی تشنہ دہانی کے باعث پانی نہیں پیتے ہیں۔ گھوڑا جو بھوکا پیاسا تھا اپنے سوار کی حالت دیکھ کر پانی نہیں پیتا ہے۔ اس دردناک واقعے کو انیسؔ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری کو مسرت حاصل ہوتی ہے:

چھاتی تک اس نے پانی کو دیکھا جو ایک بار
گھوڑے کا دل ہوا صفت موج بیقرار
حسرت سے منہ پھرا کے نظر کی سوئے سوار
بولے یہ باگ چھوڑ کے عباس نامدار
تو پی لے اے فرس کہ بہت تشنہ کام ہے
ہم پر تو بے حسینؑ یہ پانی حرام ہے
گردن ہلا کے کہنے لگا، اسپ تیز گام
بے ذوالجناح مجھ پہ بھی پانی ہے یہ حرام
اس قوم میں نہیں کہ ڈبو دوں وفا کا نام
آقا ابھی حسینؑ کے بچے ہیں تشنہ کام

مطلب یہ ہے کہ ذکر وفا چار سو رہے
ترخشک لب نہ ہوں تو نہ ہوں آبرو رہے
ہر چند تین روز سے ہے پیاس کا وفور
پیتا یہ خانہ زاد بھی ، پیتے اگر حضور
پر ہے یہ امر آپ کی دریادلی سے دور
جانیں بچیں صغیروں کی فکر اسکی ہے ضرور
ناموس مصطفٰے میں تلاطم ہے رات سے
اب جلد مشک بھر کے نکلیے فرات سے [۱۷]

فاروقی صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میر انیسؔ سب سے بڑے مرثیہ گو ہیں لیکن دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ مداحی کو عروج پر پہونچانے والے مرزا دبیرؔ اور مرقع نگاری کو کمال تک پہنچانے والے میر انیسؔ تھے لیکن یہ بتانے میں پہلوتہی کرتے ہیں کہ مرقع نگاری سے ان کا مطلب کیا ہے۔ اگر مرقع نگاری کسی واقعے یا جذبے کو حسن وخوبی سے بیان کرنا ہے کہ اسکی آنکھوں کے سامنے آجائے یا شاعر کے حسب منشا ہم شدت وقوت سے متاثر ہوں تو پھر انیسؔ کے متعلق یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ ''ان کے یہاں صحیح جذبات نگاری کا فقدان ہے اور انہوں نے واقعیت کا بہت کم لحاظ کیا ہے'' فاروقی صاحب نے لکھا:

''میر انیسؔ کے بیانات میں کبھی کبھی حقیقت نگاری کی جھلک بھی نظر آتی ہے مگر اس میں عامیانہ نفسیاتی باتوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔''

مراثی انیسؔ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسؔ نفسیات کے ماہر ہیں، جس زمانے میں انیسؔ مرثیے لکھ رہے تھے اس وقت تک نفسیات علم کی ایک باضابطہ شاخ کی

حیثیت سے مرتب نہیں ہوئی تھی ۔ مکالموں میں ان کا جواب نہیں ۔ ان کے مکالموں کی زبان ان کے کرداروں کی عمر، جنس، طبقے اور مرتبے کے اعتبار سے بدلتی جاتی ہے۔ امام کے خیمۂ مبارک سے علم رسمی شان سے نکلنے والا ہے۔ مجاہد اور عقیدت مند رفقا قطار باندھے، علم کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں اور سرفروشی پر آمادہ ہیں ۔ اس منظر نامے میں بھی انیسؔ کی نفسیات پر پکڑ قابل دید ہے:

رخ ہے کسی کا جوش شجاعت سے لالہ رنگ
کوئی سنوارتا ہے بدن پر سلاح جنگ
جھک جھک کے چست کرتا ہے کوئی فرس کا تنگ
چلّے سے جوڑتا ہے کوئی فاقہ کش، خدنگ
بھالا سنبھالتا ہے کوئی جھوم جھوم کے
تنتا ہے کوئی تیغ کے قبضے کو چوم کے
ملتا ہے ہنس کے ایک جواں ایک کے گلے
ساری خوشی یہ ہے کہ بس اب خلد میں چلے
چہرے وہ سرخ سرخ وہ جرأت کے ولولے
حق سے یہ التجا کہ نہ رن سے قدم ٹلے
مر کر بھی دل میں الفت حیدرؑ کی بور ہے
پانی ہمیں ملے نہ ملے آبرو رہے

سن رسیدہ رفیق حبیب ابن مظاہر کی نفسیاتی کیفیت بھی ملاحظہ فرمائیں:

یہ سن کے شاد ہو گئی فوج حسینؑ سب
آئے رفیق سب، در دولت پہ با ادب

بو لے حبیب ابن مظاہر کہ شکر رب
ہاں سرفروشو! جنگ وجدل کا مزہ ہے اب
سر دے کے، لے بہشت کی جس کو تلاش ہو
دیکھیں علم کے سایے میں کس کس کی لاش ہو

انیسؔ جناب زینب اور حضرت عباس کی گفتگو نقل کرتے ہوئے اس نفسیات کی طرف شاعرانہ اشارہ کرتے ہیں:

زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھیں بار بار
منصب مبارک اے شہ مرداں کے یادگار
کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباس ذی وقار
مجھ کو سمجھئے عون و محمد کا جاں نثار
ان کی طرف سے مہتمم بندو بست ہوں
مالک یہ شاہزادے ہیں میں پیش دست ہوں

فاروقی صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں:

''انیسؔ و دبیرؔ دونوں نے رزمیہ شاعری کے حق کو ادا کیا (کا حق ادا کیا) لیکن حقیقت سے کسی کو سروکار نہ تھا''۔

آثرؔ صاحب فرماتے ہیں:

''ایپک یا رزمیہ شاعری میں مبالغہ اور حقیقت کی تعریف ہی لایعنی ہے۔ ایسی شاعری میں مبالغہ آرٹ کا ویسا ہی جزو ہے جیسے حقیقت نگاری۔ ایپک شاعری میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ حقیقت کیا ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ شاعر نے حقیقت کو کس نگاہ سے دیکھا اور کس

موثر پیرایہ میں بیان کیا.....محض بیان واقعہ شاعری نہیں ہے
ایسا کرنا سائنس کا کام ہے ۔ شاعرانہ صداقت یہ ہے کہ ہم
واقعات کے جذباتی تاثرات کو دیانتداری سے بیان کر دیں ۔ یہ
بتا دیں کہ ہم پر اس واقعہ کا کیا اثر ہوا۔ کیا خوشی یا غم حاصل ہوا۔
ہمارے جذبات امید یا دہشت ، حیرت یا مذہبی احترام میں
کیا ہیجان و اشتعال پیدا ہوا ۔ لہٰذا شاعری میں صداقت کی پہلی
پہچان یہ نہیں کہ اشیا بجائے خود کیا ہیں بلکہ یہ کہ ان میں کیا حسن
ہے، کیا رمزیت ہے، کیا دلکشی ہے، کیا معنویت ہے''۔۱۸

آثر صاحب کی تصدیق ارسطو کی شعریات سے ہوتی ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ ٹریجڈی کسی ایسے عمل کی نقل ہے جو اہم ہے سالم ہے اور معقول حجم رکھتا ہے ۔ اسکی زبان مزین اور مسرت مہیا کرنے والی ہوتی ہے ۔ ارسطو کے اقوال کا اہم جزو وہ ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ شاعر اس کا پابند نہیں کہ جو کچھ وقوع پذیر ہوا ہے وہی بیان کرے بلکہ وہ بھی بیان کر سکتا ہے جو وقوع پذیر ہو سکتا تھا جس کا وقوع پذیر ہونا قرائن یا امکانات کا لازمی نتیجہ تھا۔ یہی شاعر اور مورخ میں فرق ہے ۔ ارسطو کے وقت سے عہد حاضر تک ایپک کے مفہوم یا خصوصیات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی البتہ اسکے عمل اور اطلاق کا دائرہ وسیع ہوا ہے ۔ ناقدین نے اسکے مجوزہ اصول کو تسلیم کر لیا ہے اور بقول شبلی نعمانی ''شاعری میں اصلیت و واقعیت کا لحاظ تاریخی حیثیت سے نہیں کیا جاتا بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ شاعر کو بیان کردہ واقعات کا یقین ہے کہ نہیں''، یعنی شبلی کے مطابق ایسی شاعری آرٹ ہے محض واقعات کا قلمبند کرنا نہیں۔

یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ جتنی ایپک نظمیں ہیں اور جس قوم سے متعلق ہیں وہ بالعموم وہاں کے دیوتاؤں یا بلند مرتبت قومی سورماؤں کے کارنامے ہیں اور ان سب میں

مافوق الفطرت اور حیرت انگیز عناصر بھی کم و بیش پائے جاتے ہیں نیز ان افسانوں یا اساطیر کو مذہبی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اثر صاحب ایپک پر طویل بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایپک شاعری کے جو خصوصیات بیان کیے گئے میر انیسؔ کی شاعری ان تمام لوازم کو پورا کرتی ہے۔ اس کا ہیرو وہ شخص ہے جس کی عظمت دنیائے اسلام کو تسلیم ہے بلکہ دوسرے مذاہب والے بھی ادب و احترام کرتے ہیں اور اسکی قربانیوں کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور سراہتے ہیں ۔ انیسؔ مورخ نہیں شاعر ہیں ۔ حسینؑ کے کردار کے انسان کا خاص حالات میں کیا طرز عمل ہوگا، کیا برتاؤ ہوگا، کیا جذبات ہوں گے یا کیا ہونا چاہیئے اسکی بے مثل مصوری انیسؔ سے شروع ہو کر انیسؔ پر ختم ہوگئی''۔۱۹

یہاں پر راقم الحروف آثرؔ کے اس قول کی تائید کے لیے انیسؔ کے ایک مرثیے کے چند بند پیش کر رہا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انیسؔ کی مصوری کس پائے کی ہے:

آئے سجادۂ طاعت پہ امام دو جہاں
اس طرف طبل بجا، یاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلّی کی زباں جن کی حدیث و قرآں
وہ نمازی کہ جو ایماں کے تن پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کیے تلواروں میں
عرش اعظم کو ہلاتی تھیں دعائیں ان کی
وجد کرتے تھے ملک سن کے صدائیں ان کی

وہ عمامے وہ قبائیں ، وہ عبائیں ان کی
حوریں لیتی تھیں بصد شوق بلائیں ان کی
ذکر خالق میں لب ان کے جو ہلے جاتے تھے
غنچے فردوس کے شادی سے کھلے جاتے تھے
کیا جوانان خوش اطوار تھے سبحان اللہ!
کیا رفیقان وفادار تھے سبحان اللہ!
صفدر وغازی و جرار تھے سبحان اللہ!
زاہد و عابد و ابرار تھے سبحان اللہ!
زن و فرزند سے فرقت ہوئی مسکن چھوڑا
مگر احمدؐ کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا
اللہ اللہ عجب فوج عجب غازی تھے
عجب اسوار تھے بے مثل، عجب تازی تھے
لائق مدح و سزا وارِ سرافرازی تھے
گو بہت کم تھے، پہ آمادۂ جا نبازی تھے
پیاس ایسی تھی کہ آ آ گئی جاں ہونٹوں پر
صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

مرثیے کے مرکزی کردار امام حسینؑ کو ایک جارح کا سامنا تھا۔ ایک قائد کی حیثیت سے انہوں نے جنگ وجدل کو روکنے کی ہر ممکن تدبیر کی۔ ہاتھ میں تلوار صرف اس لیے لے لی کہ انسانوں کے اس حق کی حفاظت کر سکیں کہ وہ عزت وامن کی زندگی بسر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ انیسؔ اپنے کسی شہید کو جلد بازی میں کوئی کام کرتا ہوا نہیں دکھاتے اور نہ یہ ظاہر ہونے دیتے

ہیں کہ یہ لوگ آمادۂ جنگ ہیں لیکن جنگ ان پر عائد ہی کر دی جاتی ہے تو وہ بے خوفی کے ساتھ دفاعی جنگ لڑتے ہیں۔ یہی انیسؔ کی بے مثل مصوری ہے اور یہی انیسؔ کا فن ہے۔

سطور بالا میں جو بند پیش کیے گئے ہیں وہ انیسؔ کے مرثیوں میں اخلاقیات کی بہترین مثال ہے۔ یہ الگ بات ہے ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب کو انیسؔ کے مرثیوں میں کوئی درس اخلاق نظر نہیں آتا جبکہ حالیؔ اور شبلیؔ جیسے ناقدین ادب کو اردو اصناف میں مراثی ہی میں درس اخلاق دکھائی دیتا ہے۔ فاروقی صاحب نے خاص کر انیسؔ کے مشہور زمانہ مرثیہ:

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ درج بالا مرثیے میں لکھنؤ کے شیعوں کے آداب رسم ورواج کو امام اور ان کے ساتھیوں پر عائد کیا گیا ہے۔ وہ (انیسؔ) امام کا صحیح اخلاق اپنے سامعین کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ امام کے اخلاق کو اپنے سامعین کے اخلاق کی سطح پر لے آنا چاہتے تھے۔ آثرؔ صاحب اس تعلق سے فرماتے ہیں:

''حسینؑ تو بڑی چیز ہیں۔ ان کے رفقا کے کردار اور اسوۂ حسنہ کی
جھلک فرقہ شیعہ بلکہ عام انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے یا عمومی
شیعوں کے دستور ورواج وآداب واخلاق کی نقل ہے''۔[۲۰]

راقم الحروف آثرؔ سے متفق ہے اور (فاروقی صاحب کے فرمودات کی روشنی میں) ان کی ادبی لیاقت پر شبہ بھی ہوتا ہے۔ انیسؔ کے مشہور زمانہ مرثیے کا مطلع ہی اسلامی اخلاقیات کا بہترین نمونہ ہے:

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے — جلوہ کیا سحر کے رخ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہ گردوں رکاب نے — مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

مطلع کی بیت اسلامی اخلاقیات کا وہ نمونہ ہے جس کے قیام کے لئے امام حسین کربلا کے میدان میں گئے تھے اور اپنے ساتھیوں کے حوالے سے امام حسینؑ تمام مسلمانوں کو درس دے رہے تھے کہ اگر یہ فریضہ ادا ہو گیا تو ہمارا نصب العین پورا ہو گیا۔ اور پھر ایک بند کے بعد تواتر کے ساتھ انیس اخلاقیات کا مظاہرہ کر رہے ہیں:

یہ صبح ہے وہ صبح مبارک ہے جس کی شام　　یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہنچ جائیں تشنہ کام　　لکھے خدا نماز گزاروں میں سب کے نام
سب ہیں وحید عصر یہ غل چار سو اٹھے
دنیا سے جو شہید اٹھے سرخرو اٹھے

اور آگے کے بند انسانی شرافت و نجابت کا وہ مرقع ہیں جسے علامہ اقبالؔ کے لفظوں میں انسان کامل کہتے ہیں اور وہ امام حسین اور ان کے ساتھی تھے۔ اس تناظر میں اخلاقی قدروں پر محیط ذیل کے دو بند ملاحظہ فرمائیں:

سوکھے لبوں پہ حمد الٰہی رخوں پہ نور　　خوف و ہراس، رنج و کدورت دلوں سے دور
فیاض، حق شناس، اولوالعزم ذی شعور　　خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور
کانوں کو حسن صوت سے حظ برملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

ساونت برد بار فلک مرتبت دلیر　　عالی منش سبا میں سلیماں وغا میں شیر
گردان دہر ان کی زبردستیوں سے زیر　　فاقے سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر
دنیا کو ہیچ پوچ سراپا سمجھتے ہیں
دریا دلی سے بحر کو قطرا سمجھتے ہیں

درج بالا بند بطور مثال پیش کیے گئے ہیں۔ انیسؔ کا کلام اخلاقی عناصر کا ایسا

گلدستہ ہے جس کی مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی۔

درج بالا بے سر و پا اعتراضات کے علاوہ فاروقی صاحب نے مزید اعتراضات بھی کیے ہیں کہیں وہ انیسؔ کی جذبات نگاری کو ناقص بتاتے ہیں، کہیں انیسؔ کے مرثیوں میں ہندوستانی عناصر کو غیر ضروری سمجھتے ہیں لیکن جعفر علی خاں اثرؔ نے بہت ہی متوازن انداز میں ان کی غلط فہمی کے ازالے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فاروقی صاحب کی یہ غلط فہمی مرثیے کی فضا سے لاعلمی کے سبب ہے ڈاکٹر اعجاز حسین ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ان کی تنقید نگاری زبان و بیان کی دیکھ بھال سے تعلق رکھتی ہے
اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس معرکہ میں کاوش و نکتہ رسی سے کام
لیتے ہیں''۔۲۱

بہر حال اس مختصر سے جائزہ کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اثرؔ لکھنوی نے ڈاکٹر احسن فاروقی کی مرثیہ اور انیسؔ کے تئیں غلط فہمی کا بہت ہی مثبت اور معروضی انداز میں ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے اور میری ناقص رائے میں ایک غیر جانبدار ناقد کی یہی خوبی ہے اور یہی خوبی انہیں انیسؔ شناسوں میں ممتاز مقام کا حامل بناتی ہے۔

○○○

حواشی:

۱؎ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ: ڈاکٹر ہلال نقوی: محمدی ٹرسٹ کراچی: فروری ۱۹۹۴ء: ص ۱۲۶
۲؎ اردو میں تنقید: احسن فاروقی: ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ: سنہ ندارد: ص ۱۲۱
۳؎ یادوں کی برات: جوشؔ ملیح آبادی: اے ون آفسیٹ پریس دہلی: ۱۹۹۰: ص ۴۷۴
۴؎ ایضاً: ص ۴۷۴
۵؎ بیک کور، انیس کی مرثیہ نگاری: اثرؔ لکھنوی: دانش محل لکھنؤ: مارچ ۱۹۵۱ء
۶؎ ایضاً
۷؎ لکھنؤ کی لسانی خدمات: ڈاکٹر حامد اللہ ندوی: مکتبہ جامعہ دہلی: اگست ۱۹۷۵ء
۸؎ مرثیہ آئینہ شہادت: جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی: الواعظ صفدر پریس لکھنؤ: ۱۹۵۴ء
۹؎ مرثیہ ساز حریث: نسیم امروہوی: ناشر نرولی ہاؤس لکھنؤ: اشاعت سوم ۱۹۴۲ء
۱۰؎ ایضاً: ص ج
۱۱؎ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ: ڈاکٹر ہلال نقوی: ص ۲۸۳
۱۲؎ انیس کی مرثیہ نگاری: جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی: ص ۶۔۵
۱۳؎ ایضاً: ص ۷۔۶
۱۴؎ ایضاً: ص ۱۰
۱۵؎ ایضاً: ص ۱۷
۱۶؎ میر انیسؔ: علی جواد زیدی: ساہتیہ اکادمی دہلی: ۱۹۹۱ء: ص ۹۵
۱۷؎ انیس کے مرثیے (جلد اول): مرتبہ صالحہ عابد حسین: ترقی اردو بیورو دہلی: ۱۹۹۰ء: ص ۱۶۳
۱۸؎ انیسؔ کی مرثیہ نگاری: جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی: ص ۲۹۔۲۸
۱۹؎ ایضاً: ص ۳۱
۲۰؎ ایضاً: ص ۳۷
۲۱؎ مختصر تاریخ ادب اردو: ڈاکٹر اعجاز حسین: اردو کتاب گھر دہلی: سنہ ندارد: ص ۱۴۳

فراستؔ زید پوری کے اجتہادات

لکھنؤ سے تقریباً ۴۵ کلومیٹر مشرق بارہ بنکی ضلع کا ادب نواز اور علم دوست قصبہ زید پور جس کے لئے دبستان زید پور کے ایک شاعر مودتؔ زید پوری نے کہا:

لکھنؤ کی مرکزیت ہم کو بھی تسلیم ہے ہے مگر کچھ اور ہی طرز فغان زید پور
آب کوثر سے وہ طاہر اور یہ تسنیم سے وہ زبان لکھنؤ ہے یہ زبان زید پور

مرثیہ کے مشہور پارکھی اور محقق ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ ''ہندوستان کے بہت سے مقامات کی طرح زید پور بھی وہ جگہ ہے جسے مرثیے کے ایک بڑے پلیٹ فارم کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔''۱؎

انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول جب کہ دبستان لکھنؤ میں شعر و سخن کا عام چرچا تھا۔ زید پور لکھنؤ سے دور نہ تھا۔ لکھنؤ کے اس ماحول اور ادبی فضا سے اس بستی نے بھی کسب فیض کیا جس کے نتیجے میں یہاں سے اہل دل کارواں در کارواں جاتے تھے اور نقد دل کے عوض اس جنس نایاب کے خریدار بن کر عاشقان دل باختہ کے محضر میں شامل ہو جاتے تھے۔ جس کا اعتراف ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے بھی کیا ہے:

''زید پور ہمیشہ سے مرکز علم و ادب رہا ہے''۔۲؎

اس علمی روایت کی وجہ سے زید پور انیسؔ و دبیرؔ کے اثرات سے بھی نہ بچ سکا اور اس کے نتیجہ میں ان کے شاگردوں کی ایک متعدبہ تعداد ہوگئی جہاں انیسؔ کے بعد نفیسؔ نے

اس روایت کو قائم رکھا اسی طرح دبیرؔ کے جانشین اوجؔ کے شاگردوں کا سلسلہ بھی باقی رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ زید پور نے دبیرؔ کے اثرات کو زیادہ قبول کیا اسکی وجہ یہ ہے کہ وقارؔ اور الہامؔ و زارؔ کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر شاعر سلسلۂ انیسؔ ونفیسؔ کی کڑی نہ بن سکا۔ اُدھر اوجؔ کے دو نامور شاگرد فراستؔ اور یونسؔ جو کثیر التلامذہ استاد تھے انہوں نے دبیرؔ کی روایت کو آگے بڑھایا جس کی وجہ سے وہاں کے شعرا میں دبیرؔ کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔

دبستان زید پور کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی تو وہاں کے دو شعرا فراستؔ اور یونسؔ کا نام جلی حرفوں سے لکھا جائے گا اس لیے کہ ان دونوں حضرات نے صرف شاعری ہی نہیں کی بلکہ انہوں نے ایک جماعت کی تربیت کی جس نے ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ فراستؔ اور یونسؔ کی قائم کردہ بنیادوں کو بھی مستحکم کیا اور اس دور کو زید پور کی ادبی تاریخ کا زریں دور بنا دیا۔ ذیل میں فراستؔ زید پوری پر گفتگو کی جارہی ہے۔

سید فراست حسین فراستؔ (۷؍ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ تا ۲۷؍صفر ۱۳۷۲ھ۔ مطابق ۲۶؍جون ۱۸۷۱ء تا اکتوبر ۱۹۵۲ء) سید ضامن حسین کے بیٹے اور شاگرد قتیلؔ مہدی حسین عبرتؔ کے نواسے تھے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی۔ ۱۹؍سال کی عمر میں پہلا مرثیہ کہا اور حضرت اوجؔ مرحوم کی خدمت میں پیش کر کے شاگردی اختیار کی۔ بڑے صاحب مطالعہ اور زود گو تھے۔ قصیدہ سلام، نوحہ، قطعات کہے لیکن مرثیہ میں نام پیدا کیا۔ انکی زود گوئی اور کلام کے مبنی بر مطالعہ ہونے کا ذکر ان کے شاگرد محسنؔ زید پوری نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے:

حال جس ناصر حضرت کا نظر سے گزرا — اسی موضوع پر اک مرثیہ تصنیف ہوا
رات کو نظم کیا صبح کو مجلس میں پڑھا — دوسرا ایسا نہ دیکھا ہنر آرا ایسا

زود گوئی کے ہنر کس نے کب ایسے پائے
کوئی اس ذہن خدا داد کو کیسے پائے

محسنؔ نے دوسری جگہ اپنے استاد کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ کلام کی وسعت اور موضوعات کی گہرائی کا اعتراف انہیں کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

ہے اس قدر کلام کہ جس کا نہیں حساب — سارا یہ ان کا دفتر مدحت ہے انتخاب
جلدیں ہوں تیس طبع ہو گر نظم لاجواب — جس طرح تیس پاروں میں ہوا یزدی کتاب

جس کی ثنا و مدح میں قرآں تمام ہے
مدحت میں ان کی یہ بھی سخن لاکلام ہے

محسنؔ نے اپنے استاد فراستؔ کو زید پور کا سب سے اہم شاعر تسلیم کیا ہے اور انہیں سرآمدِ شعرا کہتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا شہرہ ممالک غیر تک ہے:

نو سو برس ہوئے کہ ہے آباد زید پور — شاعر جو گزرے یاں وہ ہیں مشہور دور دور
حاصل تھا فن شعر میں بیشک انہیں شعور — لیکن نہ بحر نظم کو یوں کر سکے عبور

بے جا نہیں سبھوں سے جو بہتر کہوں انہیں
حق ہے سرآمد شعر اگر کہوں انہیں

مضمون بڑھے ہوئے ہیں مضامین میرؔ سے — پایا وہ اوجؔ مدح جنابِ امیرؑ سے
چھوٹا نہ وہ فراستؔ روشن ضمیر سے — کہنا جو رہ گیا تھا انیسؔ و دبیرؔ سے

شہرت ہے شہر شہر جناں میں مقام ہے
کیا لکھنؤ عراق تلک ان کا نام ہے

''ماہ کامل'' کے حوالے سے فراستؔ زید پوری نے ایک ہی بحر میں دو ہزار بند کا مرثیہ کہہ کر ایک طرح سے اہلبیت علیہم السلام کی منظوم تاریخ لکھنے کی طرف قدم بڑھایا۔ علاوہ ازیں ''تصویر وفا'' اس میں ایسے موضوعات وعنوانات پر مرثیے ہیں جن موضوعات پر اب تک مرثیے نہیں لکھے گئے تھے جیسے عبداللہ بن عمیر، عبداللہ بن یقطر، بریر بن خضیر ہمدانی،

وہب کلبی، مسلم بن عوسجہ، جون حبشی، ہلال بن نافع بجلی، عابس، شوذب، حجاج بن مسروق اور ہاشم بن عقبہ۔ اس طرح فراستؔ نے اس پہلو کے تحت علمی موضوعات کو بہت وسعت دی۔

''دبستان دبیر'' میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

> ''مرزا اوجؔ نے یہ کوشش بھی شروع کی کہ تاریخ اسلام کے جن واقعات کو مرثیہ گو حضرات عام طور پر نظر انداز کرتے ہیں ان کو بھی مرثیہ میں نظم کیا جائے تاکہ مرثیہ کی شکل میں پوری تاریخ اسلام نظم ہو جائے۔ خود انہوں نے معراج کے حالات میں ایک مرثیہ کہا اور ایک مرثیہ حضرت محمد بن ابوبکر کے حالات نظم کئے ہیں، ان کی اس تحریک سے متاثر ہو کر ان کے شاگردوں نے تاریخ اسلامی کے درجنوں واقعات نظم کر دیے جن پر قدیمی مرثیہ نگاروں نے کبھی توجہ نہیں کی تھی، گمنام شہدائے کربلا کے حال میں فراستؔ زید پوری کے مراثی اس کا سب سے بڑا نمونہ ہیں'' ۳

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ فراستؔ جیسے قادرالکلام شاعر کے کلام کا بیشتر حصہ منتظر اشاعت رہا۔ مطبوعہ کلام میں ماہ کامل ۴ (اہل بیتؑ کے حالات پر مشتمل دو ہزار بند مسدس کی شکل میں جسے چودہ حصوں پر تقسیم کر دیا ہے) ماہ ناتمام ۵ (یہ بھی چودہ معصومین کے حالات پر مشتمل چودہ مسدس ہیں) تصویر وفا ۶ (اس میں اصحاب امامؑ پر مشتمل چودہ مرثیے ہیں۔ اس میدان میں فراستؔ کو اولیت حاصل ہے) اور شہکار فراستؔ (مرتبہ سبط محمد نقوی) منظر عام پر ہیں۔

فراستؔ کے فن کو اہل نظر نے کما حقہٗ سراہا ہے علی عباس حسینی مرحوم نے اپنی تصنیف ''اردو مرثیہ'' میں فراستؔ کے کلام سے متعدد مقامات پر استشہاد کیا ہے۔ ''دبستان دبیر'' میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے تلامذہ اوجؔ کے ضمن میں اور ڈاکٹر سید سکندر آغا نے اپنی

تصنیف ''مرزا محمد اوجؔ: حیات اور کارنامے'' میں قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ مرزا میر علی جونپوری اور ڈاکٹر عرفان عباسی نے اپنے تذکروں میں نمایاں جگہ دی ہے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ فراستؔ کے کلام کا بیشتر حصہ منظر عام پر نہ آ سکا۔ اسکی وجہ یہ ہوئی کہ فراستؔ کے اخلاف ان کے کلام کی اتنی زبردست نگہداشت کرتے رہے کہ وہ کلام تقریباً نایاب ہو کے بے فیض سا ہو گیا۔ گو اب صورتِ حال بدلی ہے لیکن عام رسائی اب بھی آسان نہیں اس صورتِ حال کا تذکرہ محسنؔ زید پوری نے بڑے دکھ کے ساتھ کیا ہے:

ہے مگر اس لئے بیحد مرا دل رنجیدہ
منظر عام پہ کچھ، سب ہے سخن پوشیدہ
مرثیے قید ہیں سب بستوں میں چیدہ چیدہ
کیسے ہو پردہ نشینوں پہ کوئی گرویدہ
مصلحت حق کی اگر ہے تو شتاب اٹھے گی
حسن سب دیکھیں گے جب رخ سے نقاب اٹھے گی

فراستؔ میں مضمون آفرینی کی صلاحتیں بے پناہ تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مراثی میں بڑا تنوع اور بڑی جدت و شگفتگی پائی جاتی ہے، ان کے مراثی کا عام انداز یہ ہے کہ وہ کسی ایک علمی مسئلے کو لیتے ہیں اور مرثیہ اس انداز سے مکمل کرتے ہیں کہ وہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے اور مرثیہ کے حدود بھی قائم رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا ایک مرثیہ ہے:

باغ اعجاز کی بو سحر کے جنگل میں نہیں

اس مرثیہ میں انہوں نے اعجاز اور سحر کا فرق نمایاں کیا ہے جو ایک خالص علمی مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی مرحوم لکھا ہے کہ:

''اس مرثیہ کے ہر جزو میں مثلاً رزم کے بیان میں، گھوڑے اور
تلوار کی تعریف میں، آمد اور سراپا میں غرض ہر جگہ وہ اس مسئلہ کو
سلجھاتے رہے ہیں اور ہر منزل پر اعجاز اور سحر کے فرق واضح
کرتے چلے گئے ہیں۔ ان کا یہ انداز بیان دلکش بھی ہے اور مراثی
کی معنویت میں بھی زبردست اضافہ کر دیتا ہے۔''[۷]

فراستؔ نے اپنے مراثی میں کثرت کے ساتھ مسائل علمیہ نظم کئے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ برابر اجتہادِ فکر کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایسا مرثیہ بھی کہا ہے جو تمام تر علم تصوف پر مشتمل ہے اور اس علم کی تمام اصطلاحات بڑی خوبی کے ساتھ مرثیہ میں جمع کر دی گئی ہیں۔ یہاں پر اس مرثیہ کے چند بند پیش کئے جا رہے ہیں جس سے فراستؔ کے اجتہادِ فکر کے ساتھ ساتھ مرثیہ کے اس رنگ و آہنگ سے بھی واقفیت ہوگی:

سنیں تو دلبر پردہ نشیں کے پردہ دار
کریں ریاض حقیقت کی سیر عاشق زار
بنے محقق طوسی کا علم رنگ بہار
سلوک نام ہے جس کا وہ ہے عجب گلزار
بہت سی ہیں روشیں جن کا ایک مالک ہے
جو کوئی ان روشوں پر چلے وہ سالک ہے

اسی کے بحر محبت میں غرق ہیں غواص
وہ باغ جس میں ہیں کانٹے عذاب کے نہ قصاص
سرے پہ اس کے ہے ایمان اک روش ہے یہ خاص
ثبات و نیت و صدق و امانت و اخلاص

اسی شمار میں تو بہ کی راہ روشن ہے
وہ زہد و فقر جو اسرار حق کا مخزن ہے
اسی کے ساتھ ریاضت محاسبہ اپنا
مراقبہ کی روش اس کے سامنے تقوا
فضائے عالم خلوت سماں تفکر کا
تفکر ایسی روش ہے کہ دے رہی ہے پتا
جو رنگ صنعتوں کا چرخ تک نرالا ہے
یہ خود بہ خود نہیں کوئی بنانے والا ہے
یہی صفت ہے تفکر کی اور وصف ہو کیا
عجیب لطف ہے سالک ہی جانتا ہے مزا
بڑھا جب ان سے تو آیا مقام خوف ورجا
وہ صبر و شکر کی راہیں وسیع نام خدا
ارادت آگے ہے پھر شوق سے محبت ہے
یقیں ہے بعد یقیں کے سکوں کی حالت ہے
تو کل ایک روش ہے پسند عقل سلیم
رہ رضا کے مقابل وہ جادۂ تسلیم
وہ شان منزل توحید و اتحاد عظیم
ہے ان کا خاتمہ وحدت وہ اس کا حسن قدیم
جو کوئی ان روشوں پر چلا تو کیا دیکھا
کھلا ہوا چمن قدرت خدا دیکھا

فراستؔ نے امام حسینؑ کی رخصت کے ذیل میں بھی سلوک و تصوف کی اصطلاحات کا التزام رکھا ہے:

جتا رہے ہیں کہ تسلیم کیا رضا کیا ہے　　توکل اس پہ کرو اور آسرا کیا ہے
خدا پرستوں کا ہے امتحاں بلا کیا ہے　　خیال اس کا رہے مرضیِ خدا کیا ہے
رہیں گے صدمے اگر شکر کبریا کے ساتھ
حسین بھی بہ خدا ہوگا خوش خدا کے ساتھ

کوئی مشیت خالق سمجھ نہیں سکتا　　وہ کام چاہئے انجام جس کا ہوا چھا
یہ ہیں جچی ہوئی باتیں یہی ہے اسکی رضا　　عدو اتار لے بھائی کا سر بہن کی ردا
سہولتیں ہیں زمانہ کی سخت گیری میں
کہ ہیں چھپی ہوئی آزادیاں اسیری میں

درج بالا بند میں امام حسینؑ نے اہل حرم کو وصیتیں اور ہدایتیں فرمائی ہیں۔ ذیل کے بند میں فراستؔ نے عشق الٰہی، صبر و رضا اور عرفان و سلوک کی خوبصورت تصویر پیش کی ہے:

یہ معرفت ہے، یہ اللہ کی محبت ہے　　گواہ عشق، غریب الوطن کی رخصت ہے

☆☆☆

خدا ہی پر ہے نظر کچھ نہیں عزیزوں کا غم
نہ خوف مرگ نہ افسوس کشتگان ستم
نہ شوق کوثر و طوبیٰ نہ آرزوئے ارم
عزائے قوت بازو نہ بیٹے کا ماتم
نہ یہ خیال کہ دریا پہ کس کا لاشا ہے
نہ یہ ملال کہ ریتی یہ کون سوتا ہے

نہ اس کا دھیان کہ بازو ہوا ہے کیوں کر چاک
بھری ہے انگلیوں میں کون سی مزار کی خاک
زمیں میں چھپ کے یہ کس نے ہلا دئے افلاک
صغیر کون سا تھا تیر سے ہوا جو ہلاک
بلا کے باغ میں گل کس روش کا پھولا ہے
پڑا ہوا ہے جو خالی یہ کس کا جھولا ہے

فراستؔ نے امام حسینؑ کے کردار، آپ کے صبر اور آپ کی منزل فنا فی اللہ کی کتنی دلآویز تصویر کشی کی ہے جو درج بالا بند سے ظاہر ہوتی ہے۔ انہوں نے 'معراج' کو بھی موضوع بنا کر مرثیہ کہتے وقت اس عبادت کا خصوصیت سے ذکر کیا جو مومن کی معراج ہے اور جس کے بارے میں رسولؐ نے فرمایا کہ یہ قبول تو سارے اعمال قبول اور اگر یہ قبول نہیں تو سارے اعمال ردّ کر دیے جائیں گے۔

حجاب شب میں جو روشن چراغ ماہ ہوا
سفید مثل سحر پردۂ سیاہ ہوا
فلک کی سیر سے خوش طائر نگاہ ہوا
عروج پر شب معراج کے گواہ ہوا
زمیں پہ چرخ سے تسبیح کی صدا آئی
نمازیوں کے پھرے دن وہ رات کیا آئی

حشم قدم شہِ لولاک کا نرالا تھا
چراغ راہِ رضا روئے شاہ والا تھا
پروں سے قدسیوں کے منزلوں اجالا تھا
قمر کا مثل نہ تھا بے نظیر ہالا تھا

براق پر رُخ پر نور ضو د کھاتا تھا
چراغ حسن ہوا پر چمکتا جاتا تھا

معراج کے ذکر میں براق کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہاں پر براق کی رفتار کے لئے محاکاتی انداز بھی بڑا خوبصورت ہے:

نگاہ خلق سے پنہاں رہا ہوا کی طرح
ہوا سے رک نہ سکا نالۂ رسا کی طرح
زمیں سے جانب گردوں چلا دیا کی طرح
بلند ہو گیا تکبیر کی صدا کی طرح
وہ ایک زینۂ قربت تھا شاہ دیں کے لئے
نماز جیسے ہو معراج مومنیں کے لئے

اسی طرح ان کے اجتہادات میں سے ایک ''مرثیۂ جنت البقیع'' بھی ہے جس میں آل سعود کے ہاتھوں جنت البقیع کے روضوں کی مسماری پر مرثیہ پڑھا ہے۔ عاشور کاظمی کے مطابق یہ مرثیہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ عاشور کاظمی نے اپنی تالیف ''اردو مرثیے کا سفر''[۸] میں اس کے تین بند پیش کیے ہیں جنہیں ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

ہے جنت البقیع میں جلوہ بہشت کا
کیا رنگ اس چمن میں ہے دنیائے زشت کا
ملتا ہے لطف گلشن عنبر سر شت کا
عالم فروز نور ہے اک ایک خشت کا
خاتون جنت اس میں جو زیب مزار ہیں
ہر ذرے پر جناں کے جواہر نثار ہیں

محبوب ذو الجلال کو محبوب ہے یہ خاک
قدسی ہیں جس سے خوش، وہ خوش اسلوب ہے یہ خاک
حوریں پکارتی ہیں بہت خوب ہے یہ خاک
غازہ بنانے کے لئے مرغوب ہے یہ خاک
صحن لطیف غیرت دامان طور ہے
حیراں ہے آفتاب وہ مٹی میں نور ہے
بد خواہ کیا مٹائیں گے اس باغ کی نمود
اس کا جو باغباں ہے وہ ہے واجب الوجود
نکہت وہ ہے کہ جس سے عیاں قدرتِ و دود
اہل بہشت آتے ہیں پڑھتے ہوئے درود
کیا اصل ہے کسی چمنستاں کے پھول کی
اس خاک سے تو آتی ہے خوشبو رسولؐ کی

فراستؔ نے اپنے مرثیوں میں موضوعات کی وسعت اور تنوع مضامین کی جھلک جگہ جگہ پیش کی ہے۔ مامون رشید عباسی خلیفہ کے عہد میں قحط پڑا۔ ساری زراعتیں، کل باغ و اور چمن خشک ہو گئے۔ اس کیفیت کو فراستؔ نے امام ہشتم کے مرثیے میں بیان کی ہے:

پانی کی بوند بوند کو مٹی ترستی تھی
گلزار و کوہ و دشت پہ حسرت برستی تھی

مامون رشید نے سلطان عرب وعجم سے کہا کہ لوگ طعنے دیتے ہیں کہ چونکہ میں نے اس سال آپ کو اپنا ولی عہد بنایا ہے، اس لئے ملک پر یہ بلا نازل ہوئی ع۔

آپس میں ذکر ہے نہ مبارک ہوا یہ سال

اس لیے آپ خدا سے باران رحمت کے لیے دعا فرمائیں۔ امام رضا علیہ السلام مع خلیفۂ عباسی اور درباریوں کے ایک صحرا میں تشریف لے گئے اور آپ نے بارش کے لئے دست دعا بلند کیا:

مشغول تھے دعا میں ابھی شاہ ارجمند
جو پارۂ ہائے ابر ہوا پر ہوئے بلند
آہو کی طرح بھرنے لگیں بجلیاں زغند
چشمک تھی ان کی چشم فسوں ساز کو پسند
بڑھتا گیا سرور وہ ٹھنڈک ہوا کو تھی
کالی گھٹا کے پردے میں رحمت خدا کی تھی
لشکر وہ ابر کا وہ نقیبا نہ بانگ رعد
کالی گھٹا پہ صدقے ہو لیلائے شب کی جعد
بد ساعتیں گزر گئیں آ پہنچا وقت سعد
گھر گھر بنائے عیش و طرب حسرتوں کے بعد
کرتی تھی خلق خالق ارض و سما کا شکر
جاری زباں پہ آب، زباں پر خدا کا شکر
ذروں کی آنکھیں دیکھتی تھیں شان کردگار
حیراں تھا صحن باغ میں بیٹھا ہوا غبار
کیا نہروں کی امنگ تھی، کیا جوش آبشار
فوارے مست، اٹھتی جوانی کی وہ بہار
تھی دھوم عام اور چمن کی فضا کا ہے
جو کچھ ہے سب یہ رنگ دعائے رضا کا ہے

فراستؔ زید پوری نے الگ الگ موضوعات پر اجتہادات کئے ہیں۔ ''اردو مرثیہ'' میں علی عباس حسینی لکھتے ہیں کہ:

''فراستؔ زید پوری شاگرد مرزا اوجؔ نے چہادہ معصومین کے جوالگ الگ مرثیہ کہے ہیں اور جن کے مجموعے کا نام ''ماہ کامل'' رکھا ہے ان میں سے ایک میں جو حضرت علی ابن ابیطالب کی جنگوں سے متعلق ہے۔ جنگ لیلۃ الہریر کی بھی بڑی کامیاب مرقع کشی کی ہے'' ۹

فراستؔ کی اس کامیاب مرقع کشی کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں جس میں لیلۃ الحریر کی صفات وخصوصیات بیان کی گئی ہیں:

سرگرم حرب و ضرب تھی افواج کی بہیر
پر آخری لڑائی میں گھبرا گئے شریر
رن میں تمام رات رہا شور دار و گیر
کہتے ہیں جس کو معرکۂ لیلۃ الہریر
پوشیدہ شکل راحت و آرام ہو گئی
حملے سحر سے ہونے لگے شام ہو گئی
دوش فلک سے گر گئی خورشید کی سپر
تیغیں بہادروں کی رہیں رن میں جلوہ گر
مرتے تھے بانکپن پہ جوانان پُر جگر
کچھ خوف جاں نہ ظلمت شب کی طرف نظر
تلوار چل رہی تھی کنارے فرات کے
ڈھالوں پہ یہ گماں کہ ہوئے ٹکڑے رات کے

خوں ریز مثل چشم فوں ساز تھی وہ شب
گیسوئے مہوشاں کی طرح ڈھاتی تھی غضب
صحرائے ہولناک میں ہنگامہ تھا عجب
رن بولتا تھا، ساکن دریا تھے جاں بلب
اڑتی تھی خاک مرغ ہوا بے حواس تھے
ذرے بلند ہو کے ستاروں کے پاس تھے

قہر الٰہ تھا شب محشر نما کا طول
غل وحشیوں میں تھا کہ بلا کا ہوا نزول
طائر ہوائے تند کے جھونکوں سے تھے ملول
جگنو شجر سے گرتے تھے جیسے خزاں میں پھول
برباد برق خوف سے آب رواں ہوا
سبزے پہ تیرگی میں دھواں کا گماں ہوا

دنیا سیاہ کاروں کی آنکھوں میں تھی سیاہ
ظلمت میں سرمہ گوں ہوئے تھے رشتۂ نگاہ
ایسا اندھیرا گھپ تھا کہ اللہ کی پناہ
صرصر سے حال دشت پر آشوب تھا تباہ
موج ہوا تھی کاہے کو مجنوں کی آہ تھی
وہ رات مثل گیسوئے لیلیٰ سیاہ تھی

لیلۃ الہریر کی اس قیامت خیز رات میں جنگ کی منظر کشی اور اس منظر نامہ میں مولائے کائنات حضرت علیؑ کے گھوڑے ریاح کی خصوصیات اور اس کی برق رفتاری قابل دید ہے:

لو آفتاب دیں کی سواری عیاں ہوئی
جنگل میں روشنی ہوئی ظلمت نہاں ہوئی
طوفان غم میں غرق سپاہ گراں ہوئی
دریائے خوں میں تیغ کی کشتی رواں ہوئی
اسپ و سوار غرق محیط فنا ہوئے
دست خدا کے وار سے بے دست و پا ہوئے

قبضہ میں ذوالفقار ظفر پر تھا دسترس — گھوڑا اڑا ہوا میں تو گھبرائے بوالہوس
نام اس کا تھا ریاح، صبا کا تھا ہم نفس — تھا مرسل الریاح کے محبوب کا فرس
قرب علیؑ سے زین کا رتبہ بلند تھا
یہ جس کے جانشین تھے اس کا سمند تھا

اسی طرح فراست نے امام علیؑ نقی علیہ السلام کے مرثیے میں جب عباسی بادشاہ متوکل امام کو اپنی کثرت فوج دکھا کر مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ وہ مدعی ہے کہ آپ نے ایسی سپاہ نہ دیکھی ہوگی۔ حضرت نے اس کے جواب میں اسے اپنا لشکر دکھایا۔ فراست سے اس عسکر قہار کا حال سنیے اور حسنِ نظم کی داد دیجیے:

پوری نہ مدح ہو جو لکھے عمر بھر قلم
اک ضرب سرسری سے ہوں لاکھوں کے سر قلم
ہر وار میں ہوں دشت کے صدہا شجر قلم
کوہ گراں کے سنگ ہوں زیر و زبر قلم
تیغوں سے مثل خود و سپر آسماں کٹیں
وہ برق دم کہ ابر میں کیا بجلیاں کٹیں

گھوڑے وہ زیر ران کہ بیخود سوار ہیں
سب اپنے آپ کے لئے فصل بہار ہیں
سرعت کا ہے یہ دشت حدیں جسکی پار ہیں
سعدین و نیرین سموں پر نثار ہیں
ہے قدرتی بناؤ خدا کا رساز ہے
ناز وادا کو صورت وسیرت پہ ناز ہے

کیا فوج قاہرہ ہے زہے شوکت وحشم — وہ ہمہمے، وہ نعرۂ تکبیر دم بدم
دنیا کے جن وانس و بہائم جو ہوں بہم — اس نور کی بہیر سے تعداد میں ہوں کم
ہے سلسلہ کہاں سے کہاں تک پتہ نہیں
مثل ثواب نصرت دیں انتہا نہیں

ہے ان کے سامنے کسی لشکر کی اصل کیا — شورو نشورفتنۂ محشر کی اصل کیا
طوفاں کی کیا بساط ہے صرصر کی اصل کیا — پانی کا جوش کیا ہے، سمندر کی اصل کیا
آندھی کو زلزلے کو اشارے سے روک دیں
بحرِرواں کو تیغوں کی دھاروں سے روک دیں

علی عباس حسینی مرحوم رقم طراز ہیں:

''فراستؔ زیدپوری نے بعض ائمہ کا حلیہ بیان کرنے میں اپنے پیش روؤں سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ان کے بیان سے ہمارے سامنے ایک پوری تصویر آجاتی ہے۔جس پر اکثر مرثیہ گویوں کی زیادتی تشبیہات واستعارات نے پردہ سا ڈال رکھا ہے''۔ [۱۰]

علی عباس حسینی کے اس قول کی روشنی میں فراستؔ کے مجموعہ ''ماہ کامل'' سے امام

جعفر صادق علیہ السلام کا حلیۂ مبارک ملاحظہ ہو۔اس حلیہ کو بیان کرتے وقت نہ صرف امام کا حلیہ بیان کرنا مقصود ہے بلکہ فراستؔ نے اسلامی اخلاقیات کی تصویر کشی بھی کی ہے:

حلیہ امام دیں کا سنیں صاحب شعور
ہاں چشم دل زیارت شہ میں نہ ہو قصور
وہ قدمیانہ، رنگ وہ گورا، وہ رُخ کا نور
بے انتہا سیاہ تھے موئے سرِ حضور
گھونگھر پڑے تھے زلف میں چہرے پہ خال تھے
گویا وہ خال نقطۂ جیم و جمال تھے

وہ بینی کشیدہ و باریک ضوفشاں
باریک بیں تھے جس کی ستائش میں یکزباں
اُبھرا ہوا تھا بیچ میں بینی کا استخواں
کس مُنہ سے اس ابھار کی تعریف ہو بیاں
نازاں تھا حسن قدرتِ پروردگار پر
عاشق کے دل کا جوش فدا اس اُبھار پر

شارب زیادہ واضح و روشن ہلال سے
دوڈورے تن پہ سُرخ تھے خوش رنگ لال سے
انصاف خوش نہیں رگ گل کی مثال سے
واقف ہو کون صنعت خالق کے حال سے
صدقے ہو فکر شاعر نازک خیال کی
سُرخی وہ تھی صحیفۂ حسن و جمال کی

ریش سیہ تھی عہد جوانی میں خوش نما
چہرے کے ضو سے تھی شب مہتاب کی فضا
پیری کی صبح کا جو سفیدہ نظر پڑا
بھایا خضاب برگِ حنا گہرے رنگ کا
وہ ریش سرخ وہ رخ انور جناب کا
تھا مسند شفق پہ جلوس آفتاب کا

اسی مرثیے سے امام جعفر صادق کی سیرت ملاحظہ فرمائیں جن میں فراستؔ نے دو چھوٹے چھوٹے واقعات کے بیان میں جو سادگی برتی ہے وہ فنکاری کی بہترین مثال ہے:

راضی قضا پہ تھا وہ جگر بند مرتضٰی
کرتا ہے ایک شخص یہ وصفِ شہِ ہُدا
بیمار کوئی آپ کا تھا طفل مہ لقا
دولت سرا پہ اس کی عیادت کو میں گیا
حضرت کھڑے ہوئے تھے جھکا میں سلام کو
پایا مگر اُداس امامِ انام کو
اندر گئے حضور میں ٹھہرا رہا وہیں
دیکھا یہ واپسی میں کہ غم کا اثر نہیں
میں نے کہا کہ شاد رکھے رب العالمیں
شہزادہ خیریت سے ہے اے بادشاہ دیں
فرمایا وہ مریض جہاں سے گزر گیا
لڑکے کا حال دیکھ کے آیا ہوں مرگیا

پوچھا کہ پہلے رنج تھا اب کیوں نہیں ملال
بولے ہم اہلبیت نبیؐ کا یہی ہے حال
غم کا دم نزول بلا کرتے ہیں خیال
نازل وہ ہو گئی تو کیا شکر ذوالجلال
تسلیم کس طرح نہ رضا کبریا کی ہو
بندے کا دخل کیا جو مشیّت خدا کی ہو
اک نقل اور صبر و تحمل پہ ہے گواہ
پایا ملول شہ کو جوراوی نے کی نگاہ
پوچھا کہ خیریت تو ہے اے شاہِ دیں پناہ
فرمایا روک دی تھی بلندی کی میں نے راہ
تاکید کی تھی حد سے نہ ہرگز بڑھا کرے
بالائے بام گھر میں نہ کوئی چڑھا کرے
بچے کی پرورش پہ مقرر تھی ایک زن
میری کنیز ہے، نہ مگر مانا وہ سخن
کوٹھے پہ چڑھ رہی تھی کہ پہنچا میں دفعتاً
آغوش میں تھا طفل، لرزنے لگا بدن
دیکھا مجھے تو خوف سے گھبرا گئی کنیز
گودی سے طفل چھٹ گیا، تھرا گئی کنیز
گرتے ہی مر گیا وہ مرا پارۂ جگر
کچھ اس کی موت کا مرے دل پر نہیں اثر

یہ رنج ہے کہ ڈر گئی وہ مجھ کو دیکھ کر
کیوں میرا اتنا رعب ہوا اس کنیز پر
ظاہر یہ کہہ کے لطف خدا داد کر دیا
آواز دی کہ جا تجھے آزاد کر دیا

فراستؔ کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے لکھا ہے:

''فراستؔ مرحوم نے اپنی کاوشوں کے نتیجے میں زید پور میں ایک اچھا خاصا ادبی وشعری ماحول پیدا کر دیا تھا جس کے اثرات اب بھی باقی ہیں اور شاگردان فراستؔ کی بدولت آج بھی زید پور میں مرثیہ گوئی کا چلن قائم ہے''۔ ۱۱

فراستؔ نے ۲۷ر صفر ۱۳۷۲ھ کو انتقال کیا اس طرح زید پور میں بزم ادب کو منور کرنے والا شاعر اپنے پیچھے شاگردوں کا ایک قافلہ بھی چھوڑ گیا جن میں مشہور مرثیہ گو سید سرفراز حسین خیبرؔ لکھنوی، خورشید حسن مہرؔ، غلام عباس ناصرؔ زید پوری، سید محمد محسنؔ زید پوری، ابن حسن حسنؔ زید پوری، مولانا محمد باقرؔ جوراسی، نفاست حسین نفاستؔ، فائز حسین فائزؔ، سید محمد عارجؔ اور مودت حسین مودتؔ زید پوری اہمیت کے حامل ہیں۔ فراستؔ کی مجلس چہلم میں ۳۶ قطعات تاریخ پڑھے گئے۔ ایک قطعۂ تاریخ کا مادہ درج ہے۔ ع

جہاں بے نور منبر بے فراستؔ (۱۳۷۲ھ)۔

○○○

حواشی:

۱۔ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ: ڈاکٹر ہلال نقوی: کراچی: ۱۹۹۴ء: ص ۹۴ ۷
۲۔ دبستان دبیر: ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی: لکھنؤ: ۱۹۶۶ء: ص ۳۴۰
۳۔ ایضاً: ص ۱۷۹
۴۔ ماہ کامل: فراستؔ زید پوری: اثنا عشری پریس دہلی: ۱۹۳۱ء
۵۔ ماہ ناتمام: فراستؔ زید پوری: صادق پریس: ۱۹۳۷ء
۶۔ تصویر وفا: فراستؔ زید پوری: اثنا عشری پریس دہلی: ۱۳۴۰ھ
۷۔ دبستان دبیر: ص ۵۲۴
۷۔ اردو مرثیے کا سفر اور بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار: سید عاشور کاظمی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی: ۲۰۰۶ء ص ۶۶۔۲۶۵
۹۔ اردو مرثیہ: علی عباس حسینی: اردو پبلشرز لکھنؤ: سنہ ندارد: ص ۱۱۷
۱۰۔ ایضاً ص ۱۳۶۔۱۳۵
۱۱۔ دبستان دبیر: ص ۵۲۳

دبستان زید پور اور محسنؔ زید پوری

لکھنؤ سے تقریباً ۴۵ کلومیٹر پورب بارہ بنکی ضلع کا ادب نواز اور علم دوست قصبہ زید پور جس کے لئے دبستان زید پور کے ایک شاعر مودتؔ زید پوری نے کہا:

لکھنؤ کی مرکزیت ہم کو بھی تسلیم ہے
ہے مگر کچھ اور ہی طرز فغان زید پور
آب کوثر سے وہ طاہر اور یہ تسنیم سے
وہ زبان لکھنؤ ہے یہ زبان زید پور

ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ:

''ہندوستان کے بہت سے مقامات کی طرح زید پور بھی وہ جگہ ہے
جسے مرثیہ کے ایک پلیٹ فارم کی حیثیت دی جاسکتی ہے''(۱)

مفتی محمد عباس مرحوم نے زید پور کی عظمت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

در انجا است پانصد نفر زپورید
نہ مانند بوزید پر مکر وشید
کہ اہل نیاز اند ومہماں نواز
ہمہ پاک دین و ہمہ پاک باز
ولیکن من از گردش آسماں

دراں سرزمیں ہم ندیدم اماں(۲)

یہ اشعار مفتی صاحب مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (غدر) میں قیام زید پور کے دوران کہے تھے مرحوم سید سبط محمد نقوی نے لکھا ہے:

''حضرات زید پور اس پر جتنا فخر کریں کم ہے کہ انہوں نے
ایسے علامۂ اجل کی مہمان نوازی کی اور ان کے قلم حقیقت
رقم سے نہ صرف نیاز مندی ومہمان نوازی، بلکہ پاک دینی و
پاکبازی کی بھی سند پائی یہ سند ایک دو کے لئے نہیں جناب
مفتی صاحب نے ''ہمہ'' کی وسعت میں ان کا احاطہ کیا
ہے''۔(۳)

پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی رقم طراز ہیں:

''لکھنؤ کی جس شعری اور علمی وراثت پر ہم فخر کرتے ہیں
اگر اس کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوگی
کہ اس کا بڑا سرچشمہ اطراف و جوانب کے قصبات ہیں
جنہوں نے لکھنؤ کو لکھنؤ بنانے میں اہم کارنامے انجام دیے
ہیں''۔(۴)

ان قصبات میں زید پور کو یہ خصوصیت ہے کہ اس نے لکھنؤ کی اصل نمائندگی ہی نہیں کی بلکہ ایرانی اثرات اور مذہبیت جو لکھنوی ثقافت کے سب سے موثر عنصر ہیں ان کی بھرپور نمائندگی کی۔

انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول جبکہ دبستان لکھنؤ میں شعر وسخن کا عام چرچا تھا جس کی عکاسی پروفیسر احتشام حسین نے ان الفاظ میں کی ہے:

''لکھنو بن سنور کر عروس البلاد کی شکل اختیار کر رہا تھا اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی، علم دوست اور رعایا پرور حاکم، سخی اور سخن سنج امرا، صاحب علم و تدبیر وزرا اور عمال حکومت دہلی سے آئے ہوئے شعرا، فنکار، ماہرین موسیقی.....لکھنؤ پر ٹوٹ کر بہار آئی اور کل سو سال کے عرصے میں تہذیبی زندگی نے ایسے بال و پر پیدا کیے کہ دہلی تو دہلی شیراز و اصفہان کی رونق اس کے سامنے ماند پڑ گئی (۵)

زید پور لکھنؤ سے دور نہ تھا لکھنؤ کے اس ماحول اور ادبی فضا سے اس بستی نے بھی کسب فیض کیا جس کے نتیجے یہاں سے اہل دل کارواں در کارواں جاتے تھے اور نقد دل کے عوض اس جنس نایاب کے خریدار بن کر عاشقان دل باختہ کے محضر میں شامل ہو جاتے تھے۔

زید پور ایک قدیم بستی ہے یہاں پر نہ صرف یہ کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں علما، ادبا اور شعرا نظر آتے ہیں بلکہ بستی کے وجود ہی سے علما، ادبا، صلحا، حکما، اور شعرا، کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی:

''زید پور ہمیشہ سے مرکز علم و ادب رہا'' (۶)

اٹھارہویں صدی کے آخر میں جلال الدین غالبؔ، مولوی غنی تقیؔ، مولوی مہدی حسینؔ جیسے نامور عالم دین اور افاضل کا ذکر تذکروں میں محفوظ ہے۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے زمانے میں تو یہاں ہر طرف شعر و سخن کے چرچے تھے اور گھر میں پردہ نشین خواتین بھی اشعار موزوں کرنے لگی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ کے زیر اثر شعرا کی طویل فہرست موجود ہے جس کے اثرات آج بھی نمایاں ہیں، علی احمد دانشؔ ڈاکٹر سید محمد حیدر رضوی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہاں کے عوام و خواص ہمیشہ مرثیہ خوانی کی طرف مائل رہے بعض افراد تو مرزا دبیرؔ کی طرف مائل تھے مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہاں انیسؔ کے ماننے والے نہ ہوں خصوصاً میر فضل علی وقارؔ تلمیذ انیسؔ و نفیسؔ وہاں کے ممتاز شعرا میں شمار کئے جاتے تھے، انہیں کی وجہ سے میر انیسؔ سفر کی زحمت اٹھاتے اور وہاں مجلس پڑھنے جاتے تھے''۔ (۷)

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے شاگردوں میں محمد علی زائرؔ، مونس حسین مصیبؔ، فضل علی وقارؔ اور الہام حسین الہامؔ کے نام اہمیت کے حامل ہیں لیکن اوجؔ مرحوم کے شاگردوں فراستؔ، یونسؔ اور نجمؔ نے یہاں کے بچہ بچہ کو شاعر بنا دیا۔ یوں تو فراستؔ اور یونسؔ کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن غلام عباس ناصرؔ، محسنؔ زید پوری، خبیر لکھنوی، خورشید حسن مہرؔ، ابن حسن حسنؔ، باقر جوراسی، نفاستؔ، فائزؔ، عارجؔ، مودتؔ، اکملؔ، نصیریؔ، شادؔ، خادمؔ، خاتونؔ، سخنورؔ اور منتصرؔ کے اکتسابات سے صرف نظر ناممکن ہے۔ ذیل میں فراستؔ کے بھانجے اور انکے جانشین محسنؔ زید پوری کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

محسنؔ زید پوری:

محسنؔ زید پوری کا تعلق زید پور کے ایک تعلقدار گھرانے سے ہے۔ ان کے جد خان بہادر سید خادم حسین (۱۷۷۸ء تا ۱۸۰۹ء/۱۱۹۲ھ تا ۱۲۲۴ھ) نامور رئیس تھے جن کے دادا سید سبز علی سلطان احمد شاہ (بعہد ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء/۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۷ھ) کے دربار میں منصب چار صدی پر فائز تھے اور والد سید نوازش علی صفدر جنگ) بعہد ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء تا ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۴ء) کے حاکم تھے۔ خود خادم حسین کمسنی میں یتیم ہو گئے لیکن بڑے ہو کر سدھور کے ناظم ہوئے۔ حکومت وقت کے سرکش راجہ سورج پور کو شکست دینے اور حاضر

دربار کرنے کے عوض نواب سعادت علی خاں بعہد (۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء) نے انہیں خطاب خان بہادر، خلعت اور تلوار بخشی۔ ان کی محل سرا زید پور کے محلّہ پچھلی میں واقع ہے اور بڑی سرکار کے نام سے موسوم ہے اسی احاطہ میں ان کی بنائی ہوئی مسجد واقع ہے۔ انہوں نے ایک عالی شان امامباڑہ بنایا جس کی تاریخ ہے:

بنائے طیبہ اش خادم حسین نہاد (۸)

۱۲۲۳ھ

ان کے بیٹے سجاد حسین ہرُ ہرُ پور ضلع بہرائچ کے چکلہ دار تھے۔ سجاد حسین کے بیٹے بنیاد حسین (تعلقدار)۔ (۲/شوال ۱۲۵۱ھ مطابق ۸/مئی ۱۸۳۶ء۔ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ مطابق جولائی ۱۹۰۳ء) زید پور کے مقتدر رئیسوں میں تھے۔ ان کی عظمت یا شہرت کا احساس اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کا خاندان، محل سرا اور امام باڑہ انھیں کے نام سے موسوم ہے۔ نانیہالی تعلقہ بھان مئو تعلقہ میں ملا تھا۔ انھیں آنریری اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے دیوانی وفوجداری کے اختیارات حاصل تھے۔ بڑے روادار تھے۔ انہوں نے اہل ہنود کے لئے پختہ مندر بنوانے میں مدد کی اور دسہرہ کا میلہ اپنی کدوکاوش سے لگوایا۔ دسہرہ کے جلوس کے لئے اپنا سامان بھی دیتے تھے۔ بڑے محبّ اہلبیتؑ تھے۔ ان کے بیٹے اعتضاد حسین کو اپنے ماموں امجاد حسین (۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء۔ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء) جو کہ لا ولد تھے ان کا بھی تعلقہ ملا۔ اس طرح اعتضاد حسین کو سہیل پور اور بھان مؤ کا مشترکہ تعلقہ ملا۔ ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء کو وفات ہوئی۔ انھیں آنریری منصف کے اختیارات حاصل تھے۔ ان کے بیٹے استعاد حسین جو کہ باپ ہی کی زندگی میں وفات پا چکے تھے۔ حافظ رحمان ان کا تاریخی نام تھا۔ مذہب سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ۱۳۴۱ھ میں انتقال ہوا۔ یوسؔ زید پوری نے تاریخ کہی:

سروش گفت بہ یوسؔ برائے سال وفات بیافت جابجناں سید استعاد حسین

۱۳۴۱ھ

اقبال حسین (۹/رجب ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء۔ ۲۰/جمادی الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء) عبداللہ پور، بھان مئو، سہیل پور، صفدر گنج اور زید پور کے تعلقہ دار ہوئے۔ حکومت سے اعزازی منصف کے اختیارات ملے آپ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ صوبۂ اودھ کے تمام تعلقہ دار شریک ہوئے۔ راجہ صاحب محمود آباد نے سہرا باندھا۔ نکاح باقر العلوم مولانا سید محمد باقر صاحب اور حکیم مولوی سید امداد حسن صاحب نے پڑھا۔ عتبات عالیات کی زیارت سے تین بار مشرف ہوئے۔ اپنے خاندانی امامباڑہ کی توسیع وتزئین کی۔ کتابوں کے شوقین تھے اور خاندانی کتب خانے میں نایاب کتابوں کا اضافہ کیا۔ صاحب اولاد نہ تھے اس لئے ریاست کا انتظام دونوں بھائی سید بنیاد حسین اور سید بضاعت حسین کے سپرد ہوا۔

محسؔن زید پوری بنیاد حسین تعقلدار کے منجھلے بیٹے سید مستفاد حسین کے منجھلے صاحب زادے تھے۔ محسؔن کے نانا سید ضامن حسین (م ۱۳۳۸ھ/۲۰۔۱۹۱۹ء) مشہور شاعر عبرؔت زید پوری کے نواسے اور میر سخاوت حسین کے فرزند تھے اور فراستؔ جیسے نامور فرزند کے باپ۔ فروغؔ سیتاپوری کے لفظوں میں:

''وہ نہایت ہی نیک نفس اور قانع اسلاف اور سلسلۂ انساب سادات زید پور سے بہت ہی با خبر، دستورات و مراسم ضروری مابین سادات کے محقق اور ہر دل عزیز، تمام اہل برادری کے خدمات کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔''

ان کے تین بیٹے فراستؔ، نفاستؔ اور زائرؔ تینوں شاعر تھے۔ ضامنؔ نے

۱۳۳۸ھ میں انتقال کیا۔ یوسؔ زید پوری نے نثر میں تاریخ کہی:

ضامن حسین رحمہ اللہ (۱۳۳۸ھ)

محسؔن کے بڑے بھائی الحاج سید عابد رضا جج (۱۵/ ذی الحجہ ۱۳۰۸ھ مطابق جولائی ۱۸۹۱ء۔۱۲/ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ، جولائی ۱۹۶۵ء) زید پور کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے ایم۔اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۳۳۸ھ میں عہدۂ منصفی پر فائز ہوئے۔ یوسؔ زید پوری نے تاریخ کہی:

عابد رضا منصف (۱۳۳۸ھ)

بہت جلد ترقی کر کے لکھنؤ کے جج خفیفہ مقرر ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر وطن میں رہے۔ زراعت کا بھی شوق تھا اور اپنی نانیہالی جائداد میں مزید اضافہ کیا۔ خوش خطی اور نقشہ کشی میں فرد تھے اس کا نمونہ ان کے خاندانی امام باڑہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حج بیت اللہ دو بار کیا۔ عتبات عالیات کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ وطن میں انتقال کیا۔ سردارؔ مہدی زید پوری نے تاریخ کہی:

عابد رضا ساکن جنت باش (۹) (۱۳۸۵ھ)

محسؔن زید پوری (۱۰) (۷/ رجب ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۳/ نومبر ۱۸۹۸ء۔ ۳۰/ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۲/ جنوری ۱۹۸۶ء) کی مکتبی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مولوی ریاست حسین سے قرآن مجید اور یوسؔ زید پوری سے اردو و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول بارہ بنکی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اقبال حسین (تعقلدار) کی فرمائش پر انتظام ریاست میں مشغول ہوئے اور یہ سلسلہ خاتمۂ زمینداری تک قائم رہا۔ محسؔن کی شادی خاندان ہی میں میر احماد حسین کی بڑی صاحب زادی سے ہوئی ایک فرزند سید شہزاد حسین اور دو صاحبزادیاں خداوند کریم نے عطا کیں۔ شہزاد حسین کو شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا

تھا۔ قصیدہ، نوحہ، سلام اور قطعات تاریخ خوب کہتے تھے۔

محسؔن مرثیہ نگاری میں اپنے ماموں اور دبستان دبیرؔ کے سربرآوردہ استاد فراستؔ زید پوری کے شاگرد ہیں۔ فرید مہدیؔ رضوی نے انہیں شاعری میں یوسؔ کا بھی شاگرد بتایا ہے اور ثبوت میں محسؔن کے قطعۂ تاریخ کا یہ شعر پیش کیا ہے:

نظم من افسوس از اصلاح او محروم شد　　اہل علم، اہل سخن، اہل قلم یونس حسین

فراستؔ سے یہ سلسلہ تلمذ پختہ عمر میں شروع ہوا اور ان کی حیات تک جاری رہا۔ شاگرد کے مذاق شعری اور جوہر قابل کو دیکھ کر استاد نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ حقیقی بھانجے تھے ہی۔ فراستؔ مرحوم نے رموز فن اس طرح تعلیم کیے جیسے کبوتر اپنے بچوں کو دانا بھراتا ہے۔ مختصر سی مدت میں ان کا شمار اچھے شعرا میں ہونے لگا۔ محسؔن نے بھی شاگردی کا حق ادا کیا۔ ۱۳۶۰ھ میں جب محسؔن نے یہ مرثیہ ع کیا سرافراز علم کل کے شہنشاہ کا ہے۔ کہا تو یہ رباعی بھی کہی:

ممدوح سے مدحت کا صلہ ملتا ہے　　کم کیا ہے توقع سے سوا ملتا ہے
کوشش تو بہت کی ہے یہ دیکھیں محسن　　انعام میں استاد سے کیا ملتا ہے

اور جب یہ رباعی اور مرثیہ فراستؔ نے دیکھا تو بطور انعام یہ رباعی کہی:

اس مرثیے کی کیا ہو ثنا اے محسؔن　　انعام میں دیتا ہوں دعا اے محسؔن
دربند نہ یہ بعد فراستؔ ہوگا　　امید یہی ہے مرحبا اے محسؔن

فراستؔ کی دعا اور فیض تربیت کے نتیجے میں محسؔن نے تھوڑے ہی عرصے میں استادی کا مرتبہ حاصل کر لیا اور آگے چل کر وہ جانشین فراستؔ کے لقب سے یاد کئے گئے۔ محسؔن نے فراستؔ کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا اور استاد نے جو استادانہ ریاض کیا تھا شاگرد نے اس کا حق بھی ادا کیا:

زباں پہ مدح شہنشاہ خوش نہاد رہے　　سخن کی بزم میں جو ہو وہ بامراد رہے
سبق جو دے گئے استاد ہم کو یاد رہے　　الٰہی روح فراستؔ ہمیشہ شاد رہے

چمن سے لے گئے ساتھ اپنے رنگتیں گل کی
خزاں میں کون سنے گا فغانیں بلبل کی

ادنیٰ ہوں ایک خادمِ سلطانِ ارجمند　　بہر ثواب کہتا ہوں مشکل سے چند بند
پایا تھا فن شعر میں استاد کیا بلند　　جن کا کلام ہر کس و ناکس کو ہے پسند

اپنے زمانے کے وہی حسانِ نظم تھے
گویا مدرسِ ادبستانِ نظم تھے

فراستؔ سے اپنی قرابت داری، کثیر التلامذہ ہونے اور ان کی زود گوئی اور پر گوئی کا اعتراف بھی محسنؔ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

تعمیر نظم و مدح کی بنیاد بھی وہ ہیں　　قابل ثنا کے مستحق داد بھی وہ ہیں
وجہ تسلیِ دل ِناشاد بھی وہ ہیں　　ماموں بھی میرے اور مرے استاد بھی وہ ہیں

شاگرد اتنے ہیں کہ بہم انجمن ہوئی
ان کا کلام سن کے تمیز سخن ہوئی

پُر گو ہیں ایسے آپ ہی وہ آپ ہیں مثال　　حیراں ہو عقل لکھوں فراستؔ کا گر کمال
گھر سے چلے زیارت شہ کو وہ خوشخصال　　کیسا حضر سفر میں تھا تصنیف کا یہ حال

تھا ذہن کربلائے معلیٰ کی راہ میں
چھ مرثیے طویل کہے چند ماہ میں

محسنؔ نے تین مرتبہ عتبات عالیات کی زیارت کی پھر بھی ان کی خواہش ہے کہ درِ حسینؑ پر پھر حاضری کا شرف حاصل ہو جائے اس لئے چوتھے سفر کی دعا اس انداز میں کرتے ہیں:

ہوا ہے بزم غم شہ پہ رنج و غم کا اثر　　دو نیم ہو گیا محسنؔ ہر اک کا قلب و جگر
دعا خدا سے کرو تم یہ مرثیہ پڑھ کر　　الٰہی بار چہارم ہو کربلا کا سفر

ملے جو قرب حر ذی شعور کیوں آؤں
درِ حسینؑ سے پھر زید پور کیوں آؤں

ان مشاہد مشرفہ پر حاضری کے دوران بھی مرثیہ گوئی کا سلسلہ جاری رہا۔ سلطان العرب والعجم امامؑ غریب الغرباء حضرت علی رضاؑ کے روضہ مقدس کی زیارت کے تاثرات نظم فرمائے ہیں۔ وفور عقیدت کے ساتھ ساتھ حسنِ نظم بھی قابل دید ہے:

بجا ہے جتنا کرے افتخار میرا نصیب　　کہ پہونچا تا بہ در دولتِ امام غریب
غنی فقیر ہوا پائیں دولتیں وہ عجیب　　قریب شاہ تھا میں اور جناں تھی میرے قریب

نظر کے سامنے تھا اوج و پایۂ طوبیٰ
تھا سر پہ گنبد اقدس کا سایۂ طوبیٰ

ہے روضۂ دل دلبند بو تراب میں نور　　زمانہ میں ہے نہ اتنا نہ آفتاب میں نور
بھرا ہوا ہے ضریح فلک جناب میں نور　　لحد میں ہے وہ رخ پاک یا نقاب میں نور

کسی میں تاب نہیں ہے اسے جو دیکھ سکے
یہ نور وہ ہے کہ موسیٰ نہ اس کو دیکھ سکے

محسنؔ نے عتبات عالیات کی زیارتیں تو کیں لیکن حج سے محرومی انہیں بار ہا ستاتی رہی:

حج ادا کرنے کی درخواست جو دی تھی امسال　　یہ جواب آیا جہازوں پہ جگہ اب ہے محال
متحیر ہوں کہ ان لوگوں کا کیا ہوگا مآل　　جن کے ہاتھوں مرے ارمان ہوئے یوں پامال

یہ غلط تھا کہ نہیں کوئی جگہ خالی تھی
حج کے دلال جو تھے ان کی یہ دلالی تھی

محسنؔ ایک اچھے خطاط بھی تھے۔ ۱۳۵۶ء میں انہوں نے قرآن کی کتابت مکمل کی ایک مرثیے میں نصف قرآن کی کتابت کا تذکرہ ہے۔ یہ مرثیہ انہوں نے اپنے خانوادے کی ایک فرد آقا حسن کی فرمائش پر کہا تھا:

تھی جو فرمائش آقا حسن نیک شیم ہوئی پوری یہ ہے تائید خدائے اکرم
ختم کر مرثیہ کو محسنؔ کوتاہ رقم نصف قرآں ابھی لکھنے کو ہے فرصت بھی ہے کم
وہ بھی توصیف ثنائے شہ دلگیر میں ہے
سورہ والفجر کا کل مدحت شبّیر میں ہے

اور جب قرآن کی کتابت مکمل کی تو ان کے استاد یونسؔ زیدپوری نے تاریخ کہی:

کام سب لیتے ہیں کلک دوزبان سے یونسؔ کام جو چاہیے وہ کام لیا محسنؔ نے
دہن کلک سے تعریف سنیں اور تاریخ قرآن یہ لکھا نام خدا محسنؔ نے
۱۳۳۶+۲۰ ۱۳۵۶ھ

محسنؔ مرثیہ میں رثائیت کو جان سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مرثیہ کو خالص دینی صنعت کی صورت پروان چڑھنا چاہیئے۔ وہ شدت سے اس بات کے قائل ہیں کہ:

ہیں جو درکار فن مدح سرائی کے اصول پڑھئے قرآن کی تفسیر احادیث رسولؐ

ان کا عقیدہ ہے کہ قرآن احادیث نبویؐ اور اہلبیتؑ لازم وملزوم ہیں اسی لئے وہ جگہ جگہ تفاسیر واحادیث معصومینؑ کا سہارا لیتے ہیں۔ اس تناظر میں حضرت علیؑ کا تعارف محسنؔ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

علم کے شہر نبی گر ہیں تو در حیدرؑ ہیں ہوئے کعبہ میں جو پیدا وہ بشر حیدر ہیں
اولیں دور امامت کے قمر حیدرؑ ہیں مصطفیٰؐ ہیں اسی جانب کو جدھر حیدرؑ ہیں
وصف ہے کون سا احمدؐ کے جو بھائی میں نہیں
ایسا بندہ کوئی واللہ خدائی میں نہیں

فضائل ہوں یا مصائب وہ اپنا قدم آیات قرآنی، احادیث اور روایات صحیحہ کے دائرے سے باہر نہیں نکالتے اور خطیبانہ موشگافیوں اور شاعرانہ نکتہ آرائیوں، مبالغہ وغیرہ سے پرہیز کرتے ہیں:

ھل اتیٰ سے ہے عطا اور سخاوت ظاہر **وسقاھم** سے ہوئی شان سقایت ظاہر
سورۂ مائدہ کرتا ہے امامت ظاہر سورۂ واقعہ سے آپ کی وقعت ظاہر
انما آیا ہے اثبات ولایت کیلئے
اور **اکملتُ لکم** ان کی خلافت کے لئے

یا یہ اشعار:

پیش حق کب کوئی شئے ان کے برابر ٹھہری
ضربت اک طاعت کونین سے برتر ٹھہری

.....

حیف اس پر جسے اتنا نہیں احساس تلک
آپ کا ذکر ہے **اَلْحَمْدُ** سے **وَالنّاس** تلک
پاؤں یہ دوش شہنشاہ رسالت پہ رہے
کعبہ میں جلوہ نما مہر نبوت پہ رہے

محسنؔ نے اپنے مرثیہ میں جن روایات صحیحہ کو پیش کیا ہے اس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہیں۔ مرثیہ چونکہ اپنی تمام وسعتوں آفاقیتوں کے باوجود ایک مذہبی صنف سخن ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اسمیں من گڑھت واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ پروفیسر مسیح الزماں مرحوم نے اس کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مرثیہ گویوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا۔ تاریخی اور نیم تاریخی باتوں کو اپنی جگہ رہنے دیا صرف خالی جگہوں میں رنگ

بھر کران مرقعوں کو حقیقت سے زیادہ قریب کیا ہے''۔ نظم روایات میں تاریخی صحت کی پابندی میرؔ و مرزاؔ مرحومین کے بعد ہی ملنے لگتی ہے لیکن یہ عنصر محسنؔ کے کلام میں بہت حد تک نمایا ں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرثیہ منظوم تاریخ نہیں بن سکتا بہر حال شاعر تاریخی حالات کی جستجو میں ہے نظم تو نظم نثر میں بھی اسے کوتاہ دامنی کا احساس ہے:

جو امامت کے سوا عہد کا اپنے ہو علیؑ　　حیف ہے اس کی مفصل کوئی تاریخ نہیں
نثر میں جبکہ نمایاں نظر آتی ہے کمی　　نظم میں کیسے لکھی جائے سوانح عمری
پر یہ ہے فکر رسائی رہِ مدحت ہو
مجملاً حال ولادت سے شہادت تک ہو

جناب عباسؑ کی شخصیت واقعۂ کربلا میں ایک اہم مقام رکھتی ہے ان کی ولادت کی تاریخ کا تعین بھی محسنؔ نے کیا ہے نیز ان مشاہدات کا تذکرہ کیا ہے جو روضۂ جناب عباسؑ پر ان کی آنکھوں نے دیکھا:

ہجری چھبیسواں سن چارم شعبان کی تھی شب　　پیدا یثرب میں ہوا جان و دل میر عرب
متفق اس پہ ہیں عالم نجف اشرف کے بھی سب　　ان کی تحقیق پہ عامل کوئی کیوں کر نہ ہو اب
دیکھا اس شب کو گیا جشن کا ساماں ہوتے
میں نے بھی دیکھا ہے روضے پہ چراغاں ہوتے

محسنؔ بڑے ہی شیدائے عزاداری اور محبّ اہلبیتؑ تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کو مرثیہ گوئی سے عشق تھا وہ مرثیہ گوئی کو اپنا فریضۂ دینی تصور کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں خلوص کا عنصر شدت سے کارفرما نظر آتا ہے وہ ہر غم پر غم اہلبیتؑ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حسینؑ کے ماتم داروں کو صرف غم حسینؑ سے واسطہ ہونا چاہیئے:

نہ میں ہوں مرثیہ گو اور نہ میں محقق فن　　نہ قدر شعر ہے مجھ کو نہ ہے تمیز سخن

دعا یہ حق سے ہے بہر حسینؑ تشنہ دہن　　عزا کی بزم سے اٹھے نہ مرثیے کا چلن
دل و دماغ فضائل سے باغ باغ رہیں
کبھی نہ مجلس و ماتم کے گل چراغ رہیں

چنانچہ ایک مرثیہ میں خاتمۂ زمینداری کا ذکر آ گیا تو کہتے ہیں:

جو ہیں جنت کے محق کیوں پئے دنیا روئیں
فائدہ کیا کہ زمینداری کا رونا روئیں

خاتمۂ زمینداری نے ان کو ان کی خاندانی جاگیر سے محروم کر دیا پھر بھی ان کے دینی جذبہ نے ان کی مرثیہ گوئی میں ایک والہانہ جذب واثر کی کیفیت پیدا کر دی چنانچہ وہ مرثیہ گوئی کی بقا کے لئے دعا کرتے ہیں:

یا خدا مرثیہ گوئی کا چلن ختم نہ ہو　　نکتہ داں ایسے بہم ہوں کہ یہ فن ختم نہ ہو
رونق محفل ارباب سخن ختم نہ ہو　　ستم دست خزاں سے یہ چمن ختم نہ ہو
گلفشانی سے گلستاں نہ یہ مجبور رہے
واپس آ جائے بہار اور یہ خزاں دور رہے

محسنؔ مرثیہ گوئی کو سرمایۂ آخرت سمجھتے ہیں انہیں اس بات کا سخت افسوس ہے کہ دور حاضر کے شعرا مرثیہ گوئی پر توجہ نہیں دیتے۔ انہوں نے اپنے عہد کے شعرا پر ایک والہانہ تنقید کی اور مرثیہ کہنے کی تلقین بھی:

جن کی تصنیف میں ہے زور جوانی و شباب　　وہ بھی کھو بیٹھے ہیں اب مرثیہ گوئی کا ثواب
مفت میں کر رہے ہیں زندگیاں اپنی خراب　　کہنے کو مرثیہ کہیے تو یہ دیتے ہیں جواب
ہم کو فکر سحر و شام سے کب فرصت ہے
رات دن گردش ایام سے کب فرصت ہے

مرثیوں میں رثائیت کا عنصر کم ہو جانا محسنؔ کے لئے تکلیف دہ ہے اس لئے کہ رثائیت ہی مآل مرثیہ ہے۔احتجاج کا یہ انداز ملاحظہ فرمائیں:

مدح گویوں نے کیا مرثیہ گوئی کو سلام　　طرز یہ شہر کی مشہور مجالس میں ہے عام
ساقی نامہ ہی پر کر دیتے ہیں مجلس کو تمام　　نہ مصائب نہ کوئی حال غم افزائے امام
دل ہوئے خوش مگر ایک آنکھ بھی پرنم نہ ہوئی
محفل مدح ہوئی مجلس ماتم نہ ہوئی

محسنؔ نے جس دور میں مرثیہ گوئی شروع کی اس وقت ترقی پسند رجحانات مرثیوں میں داخل ہو چکے تھے۔وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تو نہیں تھے لیکن اس کی جھلک ان کے مرثیوں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ان کے مرثیوں کی زبان صاف اور سادہ ہے۔مراثی میں علمی،فکری اور عصری مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔انہوں نے جگہ جگہ اپنے مراثی میں اس بات پر زور دیا ہے کہ مرثیوں میں نئے موضوعات و اسالیب کو داخل کیا جائے۔چنانچہ مرثیہ گوئی کے زوال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہیں جو کہ فخر زمن ناظمان خوش تدبیر　　وہ اک احاطۂ طرز کہن میں سب ہیں اسیر
دکھا گئے ہیں جو راہِ سخن انیسؔ و دبیرؔ　　اسی لکیر کے سو سال سے بنے ہیں فقیر
بیاں کا طرز وہی نظم کا نظام وہی
کہ ہے شروع سے آخر تک انتظام وہی

وہی ہے مرثیہ کا چہرہ اور وہی صورت　　وہی ہے تیغ کا دم گھوڑے کی وہی سرعت
وہی ہے رنگ طبیعت وہی ہے ذہنیت　　وہی بہارو خزاں اور مناظر قدرت
زمانہ تیزیٔ رفتار سے کہاں پہنچا
ہمارا ذہن بھی اب تک نہیں وہاں پہنچا

یوں تو مرثیہ کی ہیئت پر سوداؔ نے کئی تجربے کئے لیکن قبول عام مسدس کو ہوا۔میر ضمیرؔ کی اس ''طرز نوی'' جس نے مرثیہ کو مسدس کی شکل میں فنی حیثیت دی اور سراپا اور صف آرائی کو داخل کیا۔بعد میں انیسؔ و دبیرؔ نے ضمیرؔ کی اس بلند و بالا عمارت کو اس طرح آراستہ کیا کہ دنیا ان کی استادی و کمال فن کی معترف بن گئی۔ان دونوں اساتذہ نے مرثیہ کو ایک خاص،ممتاز اور رفیع مقام دیا اور اسے غیر معمولی ادبی اہمیت کا حامل بنا دیا۔انیسؔ و دبیرؔ کے بعد ان کے شاگردوں اور مرثیہ گو خانوادے کے دوسرے افراد نے اس صنف میں گل بوٹے کھلائے۔جن سے زبان کی وسعت اور ان حضرات کی قادرالکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔چند فروعی ایجادات کے علاوہ مرثیہ انیسؔ و دبیرؔ سے آگے نہ بڑھ سکا اس کا بنیادی سبب بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید اختر نے لکھا:

''ان مرثیہ گویوں کی تقلید پسندی نے انہیں کوئی نئی راہ نکالنے اور
جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دی'' (۱۱)

محسنؔ نے بھی ان اساتذۂ فن کو نذرانہ خلوص پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اساتذہ اس لئے مرجع تقلید ہیں کہ وہ زمانہ کو طرز جدید کا درس دے گئے:

یہ دونوں مرثیہ گو واقعی تھے فرد فرید　　نہ کی انہوں نے بھی طرز قدیم کی تائید
اسی سبب سے ہیں وہ آج مرجع تقلید　　وہ دے گئے ہیں زمانے کو درس طرز جدید
وہ اپنے عہد میں گلہائے نو کھلا گئے ہیں
وہ لطف کُلُّ جَدِیْد لَذِیْذ اٹھا گئے ہیں

یہ حقیقت ہے کہ پیارے صاحب رشیدؔ ہوں یا دولہا صاحب عروجؔ،علی محمد عارفؔ ہوں یا وحیدؔ اپنی قادرالکلامی کے باوجود مرثیے کے روایتی حصار سے باہر نہیں نکل سکے۔اس حصار کو بیسویں صدی میں جوشؔ نے توڑا اور اس روایت کو جمیلؔ مظہری آلِ رضاؔ،نسیمؔ امروہوی

اور نجم آفندی وغیرہ نے آگے بڑھایا۔ بعد میں ناصر زیدپوری، زائر سیتاپوری باقر امانت خانی ، قیصر بارہوی، امید فاضلی اور وحید اختر نے اس روایت کو باقی رکھا۔ محسن بھی ان شعراء کے دوش بدوش جدید مرثیے کے کارواں میں شامل ہوئے لیکن انہوں نے اپنے عہد کے دوسرے شعرا پر تنقید کرنے کے بجائے اپنے آپ کو مخاطب کیا۔ ان کا نظریہ ہے کہ مرثیہ اس انداز کا ہو جو انفرادیت کا حامل ہو:

دل ودماغ کی آپس میں ہے یہ گفت وشنید — نہیں ہے مسئلۂ نظم لائق تقلید
ہے شوق اگر تو لکھو مرثیہ بطرز جدید — ادائے خاص سے مدح وثنا کی ہو تمہید
خیال تازہ مضامیں کی جستجو میں رہے
نہ ہمنوائی کا انداز گفتگو میں رہے

ہر ایک سے ہو طریقہ بیاں کا بدلا ہو — کلام میں لب ولہجہ زباں کا بدلا ہو
زمیں کا رنگ سماں آسماں کا بدلا ہو — چلن روانی کا طبع رواں کا بدلا ہو
دکھائے مصرع دلکش کشش جدا گانہ
ہے اپنے باغ سخن کی روش جدا گانہ

محسن کا خیال تھا کہ مرثیہ گوئی کا طرز یا اسلوب جدا گانہ ہو اس پر مستزاد یہ کہ کلام ایسا ہو کہ فنی اسقام سے پاک ہو:

وہ ہو طریقہ نہ طرز کہن کہیں جس کو — سخن ہو ایسا کہ معیار فن کہیں جس کو

محسن چونکہ ایک مذہبی گھرانے کے پروردہ ہیں اس لئے اپنے مرثیوں سے اصلاح معاشرہ کا کام بھی لینا چاہتے ہیں۔ نصف صدی قبل ہندوستان میں لادینی اور خصوصاً مسلمانوں میں دین سے بیزاری پر وہ بہت دکھی ہیں:

جس طرف دیکھئے آتے ہیں نظر تارک دیں — جہلاء خوش ہیں نہایت علماء ہیں غمگیں

ہیں تفکر میں بہت مالک املاک و زمیں — ہے رذیلوں کا زمانہ شرفاء خانہ نشیں
لوٹ ہر سمت ہے محفوظ کوئی جیب نہیں
غیر کا مال بھی لے لینے میں اب عیب نہیں

محسن کو اس بات کا بہت صدمہ ہے کہ مرد تو مرد عورتوں نے بھی مذہب سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ عورتیں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ ہر جگہ موجود ہیں۔ انہوں نے بڑے کرب کے ساتھ کہا ہے کہ اب مردوں کی حیا وشرم بھی ختم ہوگئی ہے اور وہ اپنی عورتوں کو بے پردہ رکھتے ہیں:

بے حجابی کا چلن عورتوں کا جلسوں میں شور — گئی مردوں کی حیا دیدۂ دل ہو گئے کور
زور کثرت کا زمانے میں ہے قلت کمزور — ظلم کی آئی ہیں ہر سمت گھٹائیں گھنگھور
گھر جسے کہتے ہیں ہم اب وہ قفس اپنا ہے
انتہا ہے کہ زباں پر نہیں بس اپنا ہے

انہوں نے اس کا بھی اشارہ کیا ہے کہ عورتوں کو گمان ہے کہ پردہ ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ حالانکہ یہ تصور ہی ناقص اور غیر منطقی ہے:

اس لئے عورتوں نے پردے کا چھوڑا دستور — بے حجابی سے بڑھائیں خرد وعقل وشعور
ناقص العقل زمانے میں ہوں عاقل مشہور — پیش زن مرد ہیں اب معترف عجز وقصور
وہی عورت ہے پسندیدہ کہ جو سیر کرے
نسلیں غارت ہوئی جاتی ہیں خدا خیر کرے

دوسری جنگ عظیم جس نے لاکھوں افراد کو موت کی نیند سلا دیا۔ ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے۔ امریکہ کے ذریعہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی تجربہ نے محسن کے ذہن ودماغ کو بھی جھنجھوڑ دیا۔ اس ذہنی کشمکش کا اشارہ اپنے ایک مرثیے میں کرتے ہیں:

جتنے دنیا میں مما لک ہیں وہ بے خوف نہیں　　خبریں دیتے ہیں یہ اخبار ہے پھر جنگ قریں
آئٹم بم کی ہوا کرتی ہیں ایجا دیں کہیں　　چین والے تو ہیں اک دوسرے پر چیں بہ جبیں
کوئی آئین وقوانین نہ شاہی کے ہیں
جس طرف دیکھئے آثار تباہی کے ہیں
نہیں باقی ہے جواب ہمت جنگ شمشیر　　جانیں لینے کی نکالی ہے نرالی تدبیر
اڑتی رہتی ہیں جہاز ان ہوائی کی بہیر　　شہروں پر پھینکتے ہیں مادۂ آتشگیر
قومیں کمزور و پریشان ہوئی جاتی ہیں
بستیاں ملکوں میں ویران ہوئی جاتی ہیں

ان حالات سے پریشان ہوکر محسنؔ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ اب دنیا میں کہیں بھی جائے امن نہیں، ہر طرف خوف وہراس کا ماحول ہے اور انسان ناامیدی کا شکار ہوگیا ہے:

مفلسی سستی ہے ہر شئ ہے گراں عالم میں　　عافیت کا نہیں ہے نام ونشاں عالم میں
گھر بھی اپنا نہیں اب جائے اماں عالم میں　　نظر آتا ہے قیامت کا سماں عالم میں
گھیرے ہر سمت سے ہے خوف وہراس انساں کو
جان سے مال سے اب ہوگئی یاس انساں کو

اور اس ماحول میں جس میں کسی کو کسی کی فکر نہیں۔ ادب، مذہب ہر جگہ ابتری ہے یہانتک کہ انسان کو انسان کا بھی خیال نہیں ہے:

حاصل انسان کو انسان کی تائید نہیں　　ملے آپس میں گلے کون کہ جب عید نہیں
بزم عالم میں ادب کی کوئی تجدید نہیں　　نظم اردو میں کہی جائے یہ امید نہیں
دین ودنیا کا یہاں حال بہت ابتر ہے
دفتر مذہب اسلام بہت ابتر ہے

ان حالات کو دیکھ کر محسنؔ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ یہ فانی دنیا جس کی کوئی حقیقت نہیں اس کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں چنانچہ وہ عمل خیر کی تلقین کرتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، دنیا کی حقیقت کے تذکرے کے ساتھ ساتھ شاعر کا حسن نظم بھی ملاحظہ فرمائیں:

باغ دنیا ہے گذر گاہ صبا کہتی ہے　　جا ٹھہرنے کی نہیں ہے یہ ہوا کہتی ہے
حسن دو دن ہے ہر اک گل کی ادا کہتی ہے　　ہے سدا کب یہ عنادل کی صدا کہتی ہے
چشم نرگس کی ہے تقدیر میں حیراں ہونا
زلف وسنبل کی ہے قسمت میں پریشاں ہونا
سفر عالم باقی کا نہیں دور ہے دن　　زاد راہ اپنی مہیا کرو تم بھی محسنؔ
عمر طبعی سے زیادہ ہے تمہارا اب سن　　عمل نیک کرو جتنے ہوں تم سے ممکن
وہی مومن ہے جو آپس میں محبت سے رہے
صاف آئینۂ دل، گرد کدورت سے رہے
چھوڑو اس سن میں خدا کے لئے دنیاداری　　اپنی تم منزل مقصد کی کرو تیاری
شامل حال بہر طور ہے فضل باری　　ہوگی محسوس نہ اس راہ میں کچھ دشواری
دل چلے شوق سے اپنا روش ایماں پر
نظریں اپنی رہیں نقش قدم سلماں پر

سراپا مرثیے کا ایک اہم جزو ہے۔ محسنؔ کی زبانی امام حسینؑ کا سراپا ملاحظہ کریں:

صدقے ہیں شمس وقمر ایسی منور ہے جبیں　　دونوں ناقص ہیں نہیں اس لئے آتے ہیں قریں
رن میں پھیلا ہے جو نور رخ شاہنشہِ دیں　　آسماں کو یہ ہوس ہے کہ بنے آج زمیں
طلعت ابروئے خمدار نظر آتی ہے
رن میں کیا نور کی تلوار نظر آتی ہے

صاف ہے رشک دہ چشمۂ کوثر آنکھیں　　جن کے نظارے سے ہوتی ہیں منور آنکھیں
بخشش امت عاصی کے لیے تر آنکھیں　　چشم بددور لٹاتی ہوئی گوہر آنکھیں

یہ وہ گوہر ہیں خریدار ہے رحمت جن کی
یہ وہ گوہر ہیں کہ قیمت ہے شفاعت جن کی

مرثیے کا ایک جزو رخصت ہوتا ہے امام حسینؑ کی رخصت کا منظر محسنؔ نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے ایک بیت اور اس کے بعد کے بند ملاحظہ فرمائیں:

پئے رخصت جو شہ بیکس و تنہا اٹھا
شک یہ لوگوں کو ہوا کوئی جنازہ اٹھا

اس کے بعد امامؑ مظلوم درخیمہ پر آتے ہیں اور ایک ایک کو سلام کرتے ہیں:

کہا کہ زینبؑ و کلثوم کو سلام مرا　　حسنؑ کی بیوۂ مغموم کو سلام مرا
مری سکینۂ معصوم کو سلام مرا　　رباب و بانوئے مظلوم کو سلام مرا

سلام آخری کبریٰ پہ اُمِّ لیلیٰ پر
سلام آخری فضہ کنیز زہراؑ پر

سلام ان پر جنھوں نے فدا کئے شوہر　　سلام ان پہ ہوئے ہیں شہید جن کے پسر
سلام ان پہ کہ جن کے تباہ ہو گئے گھر　　سلام ان پہ جو ہیں مبتلائے خوف و خطر

سلام بچوں پہ جن کے جگر دو نیم ہوئے
سلام میرا صغیروں پہ جو یتیم ہوئے

اہل حرم سے رخصت اور ان پر سلام آخر کے بعد امام حسینؑ میدان میں تشریف لائے اور لشکر اعدا سے یوں خطاب کرتے ہیں:

قریب فوج مخالف جو پہونچے شاہ انام　　کیے بہ لطف یہ اعدائے دیں سے شہ نے کلام

کہ اے سپاہ رے و روم و مصر و کوفہ و شام　　میں تم سے آخری حجت یہ کر رہا ہوں تمام
پسر علیؑ کا پیمبرؐ کا نور عین ہوں میں
جو حق شناس ہوں پہچان لیں حسینؑ ہوں میں

مرثیے کا ایک جزو جنگ ہے۔ اسی جزو نے اردو شاعری کو رزمیہ شاعری سے مالا مال کیا ہے۔ جنگ کا اہم عنصر تلوار ہے۔ محسنؔ کی باریک بین نگاہ سے تلوار کا وصف ملاحظہ فرمائیں:

آپ کی سیف کی تعریف میں قاصر ہے زباں　　دم ضربت ہے جسے دوری و قربت یکساں
باڑھ وہ جس سے کسی جا نہیں دشمن کو اماں　　گھاٹ وہ گھاٹ جو ہو جائے نگاہوں سے نہاں
پانی ایسا کہ جو بہتا رہے دریا کی طرح
نور ایسا کہ جو سمٹے ید بیضا کی طرح

مرثیے میں جنگ ہی کے ضمن میں شعرا نے گھوڑے کی تعریف بڑی خوبصورتی سے کی ہے محسنؔ کا رنگ بھی قابل دید ہے:

کتب میں گھوڑے کے بارے میں ہے یہی ارقام　　وہ ذوالجناح تھا اسپ پیمبرؐ اسلام
رقم ہے یہ بھی وہ تھا دلدل رسولؐ انام　　ہے ایک یہ بھی روایت کہ مرتجز تھا نام
تھا کس لقب سے ملقب یہ بات صاف نہیں
نبیؐ کا تھا وہ فرس اس میں اختلاف نہیں

تھا ایک خاص یہ اعجاز احمدؐ مختار　　ہوئے وہ گر کسی مرکب پہ ایک بار سوار
مسن بھی ہو کے نہ بیکار وہ ہوا زنہاز　　جواں رہا وہ سوار براق کا رہوار
حضور کی جو سواری سے فیضیاب رہا
نہ مرتے مرتے جدا اس سے پھر شباب رہا

یوں تو مرثیوں میں ساقی نامہ میر ضمیرؔ کے عہد ہی سے داخل ہو گیا تھا اور دبیرؔ کے شاگرد میاں مشیرؔ اور ذکی بلگرامی نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ لیکن پیارے صاحب رشیدؔ نے ساقی نامہ کو فنی حیثیت دی جس کے بعد ساقی نامہ نے ایک روایتی شکل اختیار کر لی جس کا التزام محسنؔ نے بھی رکھا:

مدح ساقی ہے وظیفہ سحر و شام مرا　　مشغلہ اک یہی میرا ہے یہی کام مرا
یہی پیمانہ ہے میرا تو یہی جام مرا　　یہی آغاز ہے میرا یہی انجام مرا
عمر بھر ذوق رہا اس کا گوارا مجھ کو
جو بھی عالم ہو اسی کا ہے سہارا مجھ کو

ساقیا میں بھی تو ہوں اک ترے میخواروں میں　　بن یعقوبؑ کے مانند خریداروں میں
صفت موسیٰ عمراں ہوں طلبگاروں میں　　مثل عیسیٰؑ کے ہوں میں بھی ترے بیماروں میں
جی اٹھوں تیری محبت میں اگر مر جاؤں
یہی پیتا ہوا مے تالب کوثر جاؤں

مرثیے کے اجزا میں شہادت اور بین کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ محسنؔ کا قلم اس میدان میں بھی کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہے:

جلتی ریتی پہ جو پہنچا تن مجروح حسینؑ　　تپشِ خاک سے حضرت کا ہوا دل بے چین
ہوا مجبور جگر بند رسولؐ الثقلین　　اٹھ کے بیٹھا پسر فاتح صفین و حنین
پر نہ آرام ذرا قلب کو پاتے دیکھا
شمر کو سامنے خنجر بکف آتے دیکھا

مرثیے کا درج ذیل بند ملاحظہ فرمائیں اور شاعر کے کمال اور حسن عقیدت کی داد دیں:

تری طرح نہ ہوا کوئی دردمند حسینؑ　　ذبیح سے بھی ہے بالا ہزار چند حسینؑ
وہ عضو عضو جدا قطع بند بند حسینؑ　　رہا نہ سر تو ہوا اور سر بلند حسینؑ
قدم سے تیرے شکست اور کفر و شر کو ہوئی
طویل نیزے پہ معراج تیرے سر کو ہوئی

اور بین کا یہ بند بھی قابل دید ہے:

نکلی تھی خیمہ سے زینبؑ جو بصد آہ و فغاں　　دیکھا ہمشیر نے سب ذبح برادر کا سماں
سر کو معراج ملی کٹتے ہی بالائے سناں　　تن صد چاک سے لپٹی رہی وہ نوحہ کناں
بین سے لاشِ شہ عرش نشیں ہلتی تھی
عرش سے خون برستا تھا زمیں ہلتی تھی

زیر نظر مضمون میں اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے محسنؔ کی مرثیہ نگاری کے کچھ نشانات واضح کئے گئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے فن پر باقاعدہ کام کیا جائے تاکہ اردو ادب میں ان کو جائز مقام مل سکے۔

محسنؔ نے ۳۰ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ/۱۲ جنوری ۱۹۸۶ء کو اپنے وطن زید پور میں انتقال کیا اس طرح زید پور کی بزم مرثیہ گوئی کی آخری شمع گل ہو گئی۔ سید محمد رضا عابدؔ زید پوری نے تاریخ کہی مادہ درج ذیل ہے:

مقطع نظم الم مظہر تاریخ بھی ہے　　با یقیں فخر زمن آہ محمد محسنؔ

۱۴۰۶ھ

○○○

حواشی:

(۱) بیسویں صدی اور جدید مرثیہ: داکٹر ہلال نقوی؛ کراچی: ۱۹۹۴: ص ۹۴۷

(۲) تجلیات (سوانح مفتی میر محمد عباس) عزیزؔ لکھنوی: نظامی پریس لکھنؤ: ۱۳۴۴ھ: ص ۹۱-۹۰

(۳) محسنؔ زید پوری اور ان کی مرثیہ گوئی: سید سبط محمد نقوی: سرفراز لکھنؤ (رجب نمبر ۱۳۹۶ھ) ص ۱۲۳

(۴) سید شبیہ الحسن نونہروی (مقدمہ) مشمولہ یونس زید پوری حیات اور شاعری: سید فرید مہدی رضوی: نامی پریس لکھنؤ: ۱۹۸۹ء: ص ۷

(۵) افکار و مسائل: سید احتشام حسین: لکھنؤ: سنہ ندارد: ص ۹۷

(۶) دبستان دبیرؔ: ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی: لکھنؤ: ۱۹۶۶: ص ۳۴۰

(۷) ادبی میراث: علی احمد دانش: نیشنل آفسیٹ پریس لکھنؤ: ۱۹۹۶ء: ص ۲۱

(۸) شجرات طیبات؛ فروغ سیتاپوری: امیر المطابع سیتاپور: ۱۹۱۶ء: ص ۱۴۸

(۹) یادگار زید پور: سید سردار مہدی رضوی: سلطان آرٹ پریس کراچی: محرم ۱۳۹۳ھ: ص ۱۰۱-۹۹

(۱۰) سید سبط محمد نقوی نے محسنؔ کی تاریخ ولادت ۹؍رجب تحریر کیا ہے جبکہ دبستان دبیرؔ میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی اور ''یونسؔ زید پوری حیات اور شاعری'' میں سید فرید مہدی رضوی نے بھی ۷؍رجب ہی تحریر کیا ہے۔ (عابد حیدری)

(۱۱) جدید مرثیے کے محرکات و اسالیب: ڈاکٹر وحید اختر: مشمولہ دو ماہی العلم ممبئی (مرثیہ و سلام نمبر) جون ۱۹۹۳ء: ص ۵۰

خاندان اجتہاد کا اُمّی شاعر

(چھنگا صاحب حسینؔ لکھنوی الجائسی)

سید صادق علی عرف چھنگا صاحب تخلص حسینؔ کے نام سے میری واقفیت بہت چھٹپنے میں ہوئی تھی۔ والد مرحوم (جناب یعقوب حسین) کی زبانی ان کے سلام کے چند شعر اکثر سوزخوانی کے حوالے سے سنے تھے۔ اس سلام کے چند شعر حاضر خدمت ہیں:

پڑے ہیں عرش کے ٹوٹے ستارے ضوفشاں ہو کر
زمین کربلا چمکے گی اب تو آسماں ہو کر

ہوائے تیغ عباس علیؑ کا تیز دھارا ہے
پھریرے فوج اعداء کے اڑیں گے دھجیاں ہو کر

شب معراج ہے، ہیں عاشق و معشوق میں باتیں
قیامت کر رہا ہے آج پردہ درمیاں ہو کر

کھلا بعد ولادت مرتضیٰؑ کے چشم و ابرو سے
یہی اک روز بت کعبہ میں توڑیں گے جواں ہو کر

گئے باغ جناں میں ظہر تک جن جن کو جانا تھا
کھڑے ہیں شہ اکیلے یوسف بے کارواں ہو کر

حسینؔ نقش قدم پر کاملوں کے پاؤں رکھتے ہو
چلے ہو پیچھے پیچھے تم بھی گرد کارواں ہو کر

کچھ عرصہ پہلے ماہنامہ ''شعاع عمل'' لکھنؤ میں چھنگا صاحب حسینؔ پر مولانا اسیفؔ جائسی صاحب کا مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا اور وہی مضمون اس تحریر کا محرک بنا۔ ساتھ ہی پاکستان کے مشہور شاعر اور ادیب جناب ساحرؔ لکھنوی کی کتاب ''خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو'' دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ اس کتاب میں حسینؔ کے تعلق سے بہت سی معلومات فراہم کی گئی ہیں لیکن کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ کچھ جگہوں پر ساحرؔ صاحب سے تسامح ہوا ہے جس کی نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

ساحرؔ لکھنوی نے مولانا محمد باقر شمسؔ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حسینؔ کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا اور جناب مہذبؔ لکھنوی کی نقل کردہ تاریخ انتقال ۱۹۴۰ء کو غلط قرار دیا ہے۔ ساحرؔ لکھنوی نے مولانا سید آغا مہدی کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ حسینؔ کی وفات ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ ساحرؔ کا اس سلسلے میں خیال ہے کہ ''مولانا آغا مہدی کی تحقیق کردہ تاریخ وفات تقریباً حضرت شمسؔ کے قول کے مطابق ہے''۔ جبکہ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق حسینؔ کا انتقال ۱۸؍ جولائی ۱۹۳۲ء کو ہوا تھا۔ یہ تاریخ رحلت اس لیے درست ہے کہ حسینؔ کی مجلس چہلم کے رقعہ میں یہی تاریخ درج ہے۔ یہ رقعہ حسینؔ کے چھوٹے بھائی سید مجاور حسین تمنؔا جائسی کا منظوم کردہ ہے جس میں تمام مومنین، رؤسا اور علماء کو مجلس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ مجلس چہلم ۱۷؍ ربیع الثانی ۱۳۵۰ھ مطابق ۲۱؍ اگست ۱۹۳۲ء کو حسینیۂ جناب غفرانمآبؒ لکھنؤ میں منعقد ہوئی اور جس میں عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب مجتہد نے ذاکری فرمائی۔ ذیل میں وہ منظوم رقعہ بطور سند پیش کیا جا رہا ہے:

امی لقب شاعر کا ماتم

(از سید مجاور حسین تمنؔا برادر خرد چھنگا صاحب حسینؔ)

ازل سے ہوا ایسا دشمن فلک
کہ دیکھی نہ میں نے خوشی آج تک
نہ بر آئی دنیا میں حسرت کوئی
نہ پائی کبھی آہ راحت کوئی
ہوئی نازل ایسی بلا پر بلا
کہ موقع نہ آہوں کا بھی مل سکا
جو اک درد دل کا گھٹا بھی کبھی
تو فوراً اذیت بڑھی دوسری
گئے دہر سے اس طرح سب شفیق
نہیں سر پہ باقی کوئی اب شفیق
غرض یہ تو باتیں پرانی تھیں سب
وہ غم قہر ہے جس کی باری ہے اب
تھا اک دم جو باقی بڑے بھائی کا
فلک نے اسے بھی نہ رہنے دیا
یہ روز سیہ اب دکھایا مجھے
کہ ان سے بھی آخر چھڑایا مجھے
لہو دل کا آنکھوں سے سب بہہ گیا
میں ہی میں فقط گھر میں اب رہ گیا

چھری جن کے غم کی یہ دل پر چلی
تھا اک نام تو ان کا صادق علی
اور اس کے سوا دوسرا تھا جو نام
ہیں آگاہ اس سے سبھی خاص و عام
انہیں یعنی چھنگا بھی کہتے تھے سب
حسیںؔ تو تخلص تھا امی لقب
تھے ان پڑھ مگر اس قدر با کمال
کہ ملتی نہیں آج ان کی مثال
مجھے ذات پر ان کی تھا ناز بھی
وہ تھے شاعری میں سرافراز بھی
کہے مرثیے اس قدر لاجواب
کہ تاحشر جن کا نہ ہوگا جواب
نہ مغرور تھے اور نہ شہرت پسند
فقط طبع تھی ان کی جدت پسند
تھی خوشگوئی بھی بردباری بھی تھی
سخن سے عیاں پختہ کاری بھی تھی
ہے بیتوں میں ان کی یہ ربط آج تک
کہ موتی کی لڑیوں کا ہوتا ہے شک
نئے لاکھوں ملتے تھے پہلو انہیں
مضامین نو پر تھا قابو انہیں

خدا کی طرف سے یہ تھا مرتبہ
کہ ہر بند ان کا تھا اک معجزہ
غرض شب کو اٹھارہ جولائی کی
جفا ایک گردوں کی یہ بھی ہوئی
کہ تنہا مجھے چھوڑ کر وہ یہاں
گئے خود سوئے قصر باغ جناں

یہ رقعہ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ مدرستہ الواعظین لکھنؤ کے کتبخانہ میں الواعظ ۸ و ۱۶ راپریل ۱۹۳۴ء کی پشت پر چسپاں ہے۔ اس رقعہ سے ایک طرف تو حسیںؔ کی تاریخ وفات ۱۸ر جولائی ۱۹۳۲ء ثابت ہوتی ہے دوسری طرف حسیںؔ کی علمی، ادبی اور شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی ہے۔

تمنّاؔ کے اعتراف کے علاوہ مہرؔ جائسی نے اپنے ایک مرثیہ۔ ''مدح خوان خلف سید لولاک ہوں میں'' میں حسیںؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے:

تھے مرے عم سخن سنج تمنّا و حسیںؔ
مرثیے جن کے ہیں صدلائق مدح وتحسیں
عم و خال و اب و جد ذاکر مولا تھے یہیں
میں بھی آ پہنچا ہوں اب منزل آخر کے قریں
میرے مابعد جو سوچیں گے کہ وہ کیسا تھا
یہی اشعار بتائیں گے کہ مہرؔ ایسا تھا

تھے حسینؔ اپنے زمانے کے رشیدؔ اور وحیدؔ
ایسا خلاق مضامیں کہ نہ دید اور نہ شنید
عارفؔ فن خلف میر حسنؔ فر د فرید
خال جاویدؔ سا استاد بعینہ خورشیدؔ

مدح میں راہ روراہِ صواب آپ ہوئے
مرثیہ گوئی میں خود اپنا جواب آپ ہوئے

مہرؔ کے ان دو بندوں سے مترشح ہوتا ہے کہ حسینؔ کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ ان بندوں کے ذریعہ مہرؔ نے انہیں رشیدؔ اور وحیدؔ کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد کا نام میر حسن تھا اور ان کے استاد جاویدؔ تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا اعتراف بھی ہے کہ آپ نئے نئے مضامین پیش فرماتے اور مرثیہ گوئی میں آپ کا جواب نہیں تھا۔

مہذبؔ لکھنوی نے 'اسرار محن' میں لکھا ہے کہ:

''یہ بزرگ خاندان اجتہاد کی ایک فرد تھے مگر بالکل ان پڑھ ، نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ پڑھنا۔ دوسروں کی مدد سے اپنا مرثیہ لکھواتے تھے اور منبروں پر دوسروں کی مدد سے پڑھتے تھے۔''

حیدر حسین فضاؔ لکھنوی نے اپنی کتاب ''لکھنؤ کے امی شعراء'' میں اپنے استاد علامہ پرتوؔ لکھنوی کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ:۔

''حسینؔ لکھنوی حرف شناس بھی نہ تھے لیکن ذہن وحافظہ بلا کا پایا تھا۔ حسن فکر کی نسبت سے حسین، اس پر جناب جاویدؔ

لکھنوی کی اصلاح وتربیت نے حسن کلام بھی پیدا کر کے مکمل حسین بنا دیا تھا''۔

شاعری کے سلسلے میں ساحرؔ لکھنوی نے اپنی تصنیف ''خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو'' میں مولانا محمد باقر شمسؔ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''وہ ایسے باکمال شاعر تھے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان سے بڑا بھی کوئی شاعر تھا۔'' ساحرؔ نے دولہا صاحب عروجؔ کا یہ قول بھی تحریر کیا ہے کہ ''آپ فخر ہندوستان ہیں'' لیکن ساحرؔ حسینؔ کی شاعری کے سلسلے میں خاموش ہیں کہ انہوں نے شاعری کی ابتدا کب کی تھی۔ مولانا اسیفؔ جائسی نے اپنے مضمون میں ان کی شاعری کی ابتداء ۱۳۰۸ھ بتائی ہے۔ موصوف کے مطابق حسینؔ نے سب سے پہلے ایک نوحہ کہا تھا لیکن ساحرؔ اور اسیفؔ (دونوں) اس سلسلے میں خاموش ہیں کہ وہ کون سا نوحہ یا شعر تھا جس سے حسینؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا کی تھی۔

فدا علی خنجرؔ لکھنوی نے اپنے مضمون ''دربار حسینؑ کا امی شاعر'' مطبوعہ الواعظ ۸ و ۱۶ / اپریل ۱۹۳۴ء صفحہ ۲۷۔۲۸ میں لکھا ہے کہ:

''۱۳۰۸ھ میں انہیں شاعری کا شوق پیدا ہوا تھا۔ چونکہ اکثر مجتہدین کی صحبت میں حاضر باشی کا شرف حاصل رہا تھا اس سے مزاج پر مذہبی رنگ غالب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے بدلے نوحہ سے شاعری کی ابتدا کی۔''

فدا علی خنجرؔ کے مطابق پہلے پہل جو شعر کہا وہ درج ذیل ہے:

ذبح کے ہنگام ایسی پیاس تھی شبیرؑ کو
چلتے چلتے حلق پر بے آب خنجر ہو گیا

خاندان میں سید بندہ کاظم جاویدؔ موجود ہی تھے ان کی سرپرستی میں مشق سخن جاری

ہوئی۔ کچھ استاد کی شفقت، کچھ فطری ذوق کی بدولت بہت جلد ابتدائی مراحل طے ہو گئے۔
ساحرؔ لکھنوی نے سید علی احمد دانشؔ کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے کچھ مرثیے علی محمد عارفؔ کو بھی دکھائے تھے جبکہ مولانا اسیفؔ جائسی نے اپنے مضمون ''اردو کا امی مرثیہ گو'' میں تحریر کیا ہے کہ:

''حسینؔ مرحوم نہایت خوش گو شاعر تھے۔ مولوی بندہ کاظم صاحب جاویدؔ ان کے بہنوئی تھے اور وہ انہیں سے اصلاح لیتے تھے''۔

یوں تو حسینؔ شہر اور شہر کے باہر اکثر مجلسوں میں اپنا کلام پڑھتے تھے لیکن وہ مجلس خاص طور سے قابل ذکر ہے جو ہر سال ۱۹ رجب کو میر باقر سوداگر کے امامباڑہ واقع لکھنؤ میں منعقد ہوتی تھی۔ اس مجلس میں عمائد کے علاوہ شعرا کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی تھی اور وہ بڑے مجمع کے سامنے اپنا تازہ کلام پڑھ کر داد حاصل کرتے تھے۔ راقم الحروف سے ایسی ہی ایک مجلس کا ذکر سلامت رضوی مرحوم نے کیا تھا۔ ان کے مطابق وہ خود اس مجلس میں موجود تھے۔ حسینؔ منبر پر تشریف لے گئے، مرثیہ ہاتھ میں، ایک شخص منبر کے قریب کھڑا تھا اور اس نے مرثیے کا مطلع کان میں چپکے سے بتایا اور حسینؔ نے پورا مرثیہ جم کر پڑھا۔

مہذبؔ لکھنوی نے ان کی مرثیہ نگاری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''جو کچھ کہا ایسا کہا کہ بڑے بڑے خوش گویان کے دانت کھٹے کر دیے۔''

حسینؔ نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، سلام، مرثیہ، نوحہ غرض ان تمام اصناف میں ان کے کلام کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا لیکن ان کے کلام کا بیشتر حصہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ فدا علی خنجرؔ کی اطلاع کے مطابق ایک مناجات ''مقبول جہاں'' اور دو تین مرثیہ طبع ہو چکے تھے، بعد میں مہذبؔ لکھنوی نے بھی

کئی مرثیے شائع کیے۔

حسینؔ اپنے اشعار میں سیدھی سادی زبان استعمال کرتے تھے۔ ہر وقت طبیعت موزوں رہتی تھی اور ذرا سی فکر میں آمد سخن کا سلسلہ جاری ہو جاتا تھا۔ کئی موقعوں پر بہ یک وقت پوری غزل یا نوحہ وسلام تصنیف کر ڈالا۔ ایک دفعہ ان کے امی ہونے کے سبب کچھ لوگوں نے ان کے کلام کو استاد کا عطیہ سمجھا۔ کسی طرح انہیں بھی علم ہو گیا۔ چنانچہ ایک مجلس میں مشتبہ حضرات کو متوجہ کرتے ہوئے جواب دیا:

یہ حال ہو گر سب پہ عیاں بہتر ہے
حق گوئی کرے جو وہ زباں بہتر ہے
جو حکم ہو مجلس میں ابھی نظم کروں
اس شک سے حسینؔ کا امتحاں بہتر ہے

ساحرؔ لکھنوی اپنی تصنیف ''خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو'' صفحہ ۴۹۲ پر ''رباعیات'' کی ذیلی سرخی کے تحت لکھتے ہیں:۔

''سلام کی طرح چھنگا صاحب نے رباعیات بھی بڑی تعداد میں کہی تھی، مگر افسوس کہ ان کی ایک بھی رباعی دستیاب نہیں ہے۔''

ساحرؔ لکھنوی نے حسینؔ پر لکھتے وقت شاید فدا علی خنجرؔ کے مضمون کا مطالعہ نہیں کیا۔ خنجرؔ نے اپنے مضمون میں ''حسینؔ کی رباعیوں کا رنگ'' کے عنوان کے تحت دو رباعیاں پیش کی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:۔

ذرہ دیکھا فلک کا تارا دیکھا — خورشید و قمر کا روز جلوہ دیکھا
موتی ہو کہ لعل ہو کہ شمع محفل — ہر چیز میں میں نے نور تیرا دیکھا

بس کر چکیں عالم کے نظارے آنکھیں
باقی تھیں جوانی کے سہارے آنکھیں
پیری میں یہ خود بھی ہیں چراغ سحری
ہیں صبح کے ڈوبتے ستارے آنکھیں

ساحرؔ لکھنوی نے اپنی کتاب ''خاندان اجتہاد کے مرثیہ گو'' میں 'مرثیہ گوئی' کی ذیلی سرخی کے تحت بہت ہی عمدہ بحث کی ہے لیکن موصوف نے اپنی معلومات کو مہذبؔ لکھنوی یا مولانا محمد باقر شمسؔ تک محدود رکھا ہے۔ الواعظ لکھنؤ ۸ و ۱۶ اپریل ۱۹۳۴ء میں فدا علی خنجرؔ کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس کے آخر میں حسینؔ کے مراثی کے یہ بند درج ذیل سرخیوں کے تحت درج ہیں:

۱۔ تلوار کی تعریف

جوہر تھے اس میں ہار تھا یا اک گندھا ہوا
تھی آب یا تھا آگ میں دریا چھپا ہوا
قبضہ تھا یا تھا چاند سے تارا ملا ہوا
یا نہر تھی کہ جس کا تھا پانی چڑھا ہوا
ملتی تھی جب وہ دست شہ دیں پناہ سے
چالیس ہاتھ بڑھتی تھی حکم الٰہ سے

۲۔ شب معراج میں براق کا تذکرہ

ضو فگن ہو گیا محبوب سے جب زین براق
اور ہی ہو گئے اس وقت سے آئین براق
رحمت حق ہوئی نازل پئے تحسین براق
دوں جو تشبیہ پری سے تو ہو توہین براق

خصلتیں حور و نکی سی، حوروں کے سے ناز اسکے
پر جبریل ہیں گویا پر پرواز اس کے
پشت پر بار نبوت لیے مستانہ چلا یوں چلا بزم میں جیسے کوئی پیمانہ چلا
عشق معبود پیمبر میں یہ مستانہ چلا نور کو لے کے سوئے نور یہ پروانہ چلا
ہر جگہ بوئے گل و عنبر و عود آنے لگی
پر پرواز سے آواز درود آنے لگی
یہ پتہ اہل زمانہ کے نظاروں سے ملا بادصرصر کے یہ بہتے ہوئے دھاروں سے ملا
اڑ کے اونچا جو ہوا عرش کے تاروں سے ملا راستا عرش کا حوروں کے اشاروں سے ملا
جو ستارہ ہے وہ اب ماند ہوا جاتا ہے
مل کے سیاروں میں یہ چاند ہوا جاتا ہے

○○○

فقیہؔ شافعی کی 'روضاۃ البکا'

بمبئی رثائی ادب کا بھی ایک مرکز رہا ہے۔ یہاں ہر مذہب وملت کے لوگ اپنے اپنے طریقے سے عزاداری امام حسین علیہ السلام میں حصہ لیتے ہیں۔ امامیہ اور اسماعیلیہ (بوہروں) کے علاوہ اہل سنت حضرات بھی اس میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ انہوں نے رثائی ادب پر نثر ونظم میں کئی یادگاریں چھوڑیں ہیں۔ انہیں میں ایک مثنوی 'روضاۃ البکا' بھی ہے۔ سرورق پر کتاب کا نام ''روضۃ البکا'' لکھا ہے لیکن مصنف نے کتاب کا نام جابجا ''روضاۃ البکا'' ہی نظم کیا ہے۔

یہ رثائی مثنوی آج سے تقریباً سوا سو سال قبل (۱۳۰۶ھ) بمبئی کے مطبع فتح الکریم سے شائع ہوئی۔ ملا حسین واعظ کاشفی کی ''روضۃ الشہدا'' کے طرز پر لکھی گئی اس مثنوی میں کربلا کے المناک حادثے کو نظم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی نے اس مثنوی کو ۱۲۱۵ھ کے بعد کی تصنیف بتایا ہے لیکن کتاب کے مطالعے سے اس کی واضح تصدیق نہیں ہوتی۔ چونکہ فقیہؔ کا ۱۲۲۳ھ میں انتقال ہوگیا تھا اس لیے یہ مثنوی ۱۲۲۳ھ کے قبل کی تصنیف قرار پائے گی۔ اس میں سے نو مجلیس باپو میاں اوندریکر فقیہؔ نے نظم کی ہیں لیکن نویں مجلس کے مکمل ہونے کے بعد ان کا انتقال ہوگیا تو داؤد خاں جملؔ کے کہنے پر دسویں مجلس کو غلام علی مہری نے ۱۲۶۰ھ میں نظم کیا۔ کتاب کے خاتمے پر یہ معلومات فراہم کی گئی ہیں:

مصنف طرفہ روضاۃ البکا کا ہے نامی شخص یک مرجع صفا کا

فقیہؔ اسم وتخلص اس کا مشہور ہے ہر سو شاعری کا جس کی مذکور
مہرباں قدرداں داؤد خاں نام جملؔ جس کا لقب مشہور ہے عام
سو یک دن وہ بہار قدردانی لگا کہنے بہ اخلاص زبانی
برائے خاطر احباب و مونس فقیہؔ کی میں نے چھپوائیں مجالس
مگر مجلس شہادت کی دہم ہے تصانیف مصنف سے وہ کم ہے
مجھے ہے فکر بے ذکرِ شہادت نہ اس شب کو رہیں اہلِ سعادت
مناسب ہے نہ ہووے سلسلہ گم شہادت نامۂ اقدس لکھو تم
شہادت کی لکھی میں نے یہ محفل الٰہی ہو سخن مقبول ہر دل

فقیہؔ کا نام باپو میاں، خاندانی لقب اوندریکر تھا جواب مختصر ہوکر اوندرے رہ گیا ہے۔ فقیہؔ سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔ رکن الدین ابن شیخ احمد تمنؔا نے انہیں کو کنی لکھا ہے(۱) تذکرہ ''مخزن الشعرا'' میں فقیہؔ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''فقیہؔ تخلص باپو نام بمبئی کے باشندے ہیں اور بمبئی کے مشاہیر شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔(۲)

(ترجمہ)

فقیہؔ نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی مشہور تصنیف ''روضاۃ البکا'' کے علاوہ دو چھوٹی چھوٹی بیانیہ مثنویاں بھی موجود ہیں ان کی زبان صاف ستھری اور دلکش ہے۔ غزل اور قصیدے کے میدان میں بھی اپنے کارنامے یادگار چھوڑے ہیں۔ قصیدے کے چند شعر درج ہیں:

حق نے بخشا ہے نبی کو دو جہاں کی سروری رمز معنی میں خدائی ظاہری پیغمبری
باعث ذات مقدس کا نہ ہوتا گر عروج خلعت پیغمبری کوئی نہ پاتا افسری

اوج گردوں پر قمران کا غلام داغدار　　پھٹ گیا اک آن میں کرتے اشارہ سرسری
تابش گرمی نہ ہووے اس مبارک جسم پر　　خوف سے خورشید خاور کے ہے تن میں تھرتھری
نعت پیغمبر میں رہتا ہے فقیہؔ دولت عظیم　　از مناقب سرور بہتر نہیں ہے شاعری

فقیہؔ کو تاریخ گوئی کا بھی شوق تھا۔ جامع مسجد بمبئی کی تاریخ نظم کی (۳):

عطا کرد خالق رہِ مستقیم　　مقامِ مقدس چودارالنعیم
زہے بیت معمور باعزوشاں　　بنامسجدِ پاک جائے عظیم (۱۲۱۷ھ)

۱۲۱۷ھ میں اہلِ بمبئی کو ایک بڑے جانکاہ حادثے سے دو چار ہونا پڑا۔ فورٹ کے علاقے میں زبردست آگ لگی جہاں فوجی چھاؤنی اور آتشی اسلحہ جات کا زبردست ذخیرہ تھا۔ خوش قسمتی سے آگ پر بروقت قابو پالیا گیا اور شہر تباہ ہونے سے بچ گیا۔ فقیہؔ نے اس حادثے کو مثنوی کی شکل میں نظم کیا اور اس کا نام ''مثنوی بر حادثہ آتش زدگی در بمبئی'' رکھا (۴)۔ یہ مثنوی اپنی چند خصوصیات سے منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ فقیہؔ نے اس حادثے کی تفصیلات نظم کرنے سے پہلے شہر بمبئی کی تعریف وتوصیف میں کئی اشعار لکھے ہیں جس میں بمبئی شہر کی آرائش، محلوں اور کوچوں کی رونق، دکانوں کی سجاوٹ اور بمبئی کی متمول قوموں کا ذکر کیا ہے۔ اپنے بیان کو موثر بنانے کے لئے عمدہ ترکیبیں اور نادر تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں۔ آتش زدگی کے حادثے کے ایک سال بعد آتش زدہ علاقے کے مکینوں کو اپنے اپنے مکان خالی کرنے کا حکم دیا گیا۔ جب ان گھروں کو مسمار کیا جانے لگا تو لوگوں میں بڑی ابتری پھیل گئی۔ فقیہؔ نے اس کا حال ۱۲۱۸ھ میں ایک اور مثنوی میں نظم کیا تھا۔ اور اس کا نام ''مثنوی مسمارگی شہر بمبئی'' رکھا۔

فقیہؔ نے ''روضات البکا'' کے دیباچے میں اپنے استاد فیاض اور ہم عصر شاعر دوستوں کا ذکر کیا ہے ان میں قاضی یوسفؔ مرگھے، قاسمؔ مہری اور محمودؔ کے نام قابل ذکر ہیں

۔ اس مثنوی سے محمودؔ کے ''فتح نامہ'' کا سراغ ملتا ہے اس کے علاوہ قاسمؔ مہری کی نعتوں کا مجموعہ ''زین المجالس'' اور یوسفؔ مرگھے کی ''غوث الوریٰ'' کی مجلسوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس دیباچے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتابیں اس تصنیف سے قبل کافی شہرت پا چکی تھیں ان سب کے بعد فقیہؔ نے ''روضاۃ البکا'' کی تصنیف کا ارادہ کیا اس میں فقیہؔ نے یہ بھی بتایا کہ یہ مثنوی محض حصول ثواب و برکت کے لئے لکھی گئی ہے۔ فقیہؔ نے اس کا نام ''محفلِ غم'' رکھا تھا لیکن ایک بزرگ نے انہیں خواب میں آکر ہدایت دی کہ اس کا نام ''روضاۃ البکا'' رکھا جائے۔

رکھا تھا نام اس کا ''محفلِ غم''　　اسی شب خواب دیکھا میں نے ہمدم
جو اک پیرِسن میرے مقابل　　کہا مجھ کو کیا جو ''غم کی محفل''
تو اس کا نام جوں بادِ صبا رکھ　　بہت رو رو کے ''روضاۃ البکا'' رکھ

فقیہؔ نے دیباچے میں جہاں یہ بتایا ہے کہ یہ مثنوی محض حصول ثواب کے لئے کہی گئی ہے وہیں اہلِ بمبئی کے ذوق کی تعریف کی ہے اور ان کو دعائے خیر کے ساتھ یاد کیا ہے:

سو سارے قابلانِ شہر منبئی　　کہ ہیں خوبی میں مثلِ روم اور رے
عجب وہ خطۂ معروف و مشہور　　کہ اس کا نام ہے بس دور تا دور
خدا اس کو رکھے تا حشر آباد　　بحقِ مصطفٰے اور آلِ امجاد
اور اسکے ساکناں خوشنود رہویں　　بھی کارِ خیر میں موجود رہویں

فقیہؔ نے ۱۲۲۳ھ میں وفات پائی ان کے کسی دوست نے تاریخ کہی:

نہ شعرائے وقت ہمچو جامیؔ فقیہؔ　　بوصل خدا شد گرامی فقیہؔ
بسالش قلم رشکِ رخشاں نوشت　　بہ منبئی سخن سنج نامی فقیہؔ

سرورق کے بعد دوسرے صفحے پر مجلسوں کی فہرست دی گئی ہے جو اس طرح ہے۔ پہلی مجلس نعت حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔ دوسری مجلس وفات حضرت

سرور کائنات وحکایات تیسری مجلس۔ وفات جناب خیر النساء خاتون جنت حضرت فاطمہ، و شہادت صدیق اکبر وخلافت وشہادت حضرت عمر و بیان شادی حضرت امام حسین علیہ السلام باشہر بانو۔ چوتھی مجلس۔ خلافت وشہادت حضرت عثمان اور مناقب حضرت علی علیہ السلام۔ پانچویں مجلس۔ تولد وشادی وشہادت حضرت امام حسن علیہ السلام۔ چھٹی مجلس۔ ولادت و مناقب حضرت امام حسین علیہ السلام وحکایت ومعجزات۔ ساتویں مجلس شہادت حضرت مسلم مع پسران۔ آٹھویں مجلس۔ خبر شہادت حضرت مسلم وفرزندان وبیان جنگ حضرت حر۔ نویں مجلس۔ شہادت یافتن یاران وبرادران حضرت امام حسین علیہ السلام وبیان شادی وشہادت حضرت قاسم وشہادت حضرت عبداللہ بن مسلم۔ دسویں مجلس۔ شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام وختم مجالس۔

مصنف سنی القیدہ شافعی المسلک ہے اس لئے ترتیب میں اس نے اپنے عقیدے کا لحاظ رکھتے ہوئے پہلے سرور کائنات حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ وآلہ وسلم اور شہزادی کونین جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی شہادت کے واقعات کو نظم کیا ہے اس کے بعد خلفائے راشدین کے واقعات انتقال وشہادت کو پیش کیا ہے۔ مجلس پنجم حضرت امام حسن علیہ السلام کے فضائل ومصائب کے سلسلے میں ہے اور چھٹی مجلس سے امام حسین علیہ السلام کے فضائل و مصائب اور واقعات کربلا کو نظم کیا ہے۔

یہ مثنوی تاریخی اعتبار سے کافی اہم ہے اسے اس لئے لکھا گیا ہے کہ اس مثنوی کو سننے والا مختصر ہی سہی تاریخ اسلام اور واقعات کربلا سے واقف ہو جائے لیکن انہوں نے کہیں کہیں زبان کی صفائی کا خیال نہیں رکھا ہے۔ واقعات بے ربط معلوم ہوتے ہیں اور بعض مصرعے ناموزوں بھی ہیں۔ پھر بھی مصنف نے اس کتاب کو اس لئے تصنیف کیا کہ اس موضوع پر اہل بمبئی کے لئے مجالس ومحافل کے لئے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اس

ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب اردو زبان میں نظم کی گئی تا کہ عام لوگ بھی اس سے مستفید ہوں اور ایسا نہ ہو کہ کم پڑھے لکھے لوگ اس عظیم واقعہ سے ناواقف رہ جائیں۔ عام قاعدے کے مطابق اللہ کی حمد سے کتاب کی ابتدا کرتے ہیں:

کروں نامے کو نامِ حق سے بنیاد — طلب کرکر رسولؐ اللہ سے ارشاد
کہ وہ حقّ المبیں ایسا ہے قادر — کیا کن سے دونوں عالم کو ظاہر
خداوندِ جہاں یکتا و دانا — قوی قدرت میں قیوم و توانا

مجلسِ اول کے چند نعتیہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

محمد مصطفٰے کو کرکے تسلیم — کروں میں محفلِ اوّل کو ترقیم
بجان و دل ہمیشہ بندگی سے — رہوں ممتاز سرافگندگی سے
تصدّق کرکے حضرت پر دل و جان — بھی کرکے اپنے ماں باپوں کو قربان
کہ وہ احمدؐ محمدؐ مصطفٰے ہیں — یقیں دونوں جہاں کے پیشوا ہیں

مجلس اول ہی میں واقعہ معراج کو نظم کرتے ہوئے یہ روایت نظم کی ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب معراج پر تشریف لے گئے تو پوچھا کہ چاند پر داغ کیسا ہے تو حضرت جبریلؑ نے چاند پر داغ کی یہ توجیہہ بیان کی:

کہ اے فخرِ زماں سلطانِ وحدت — سراپا صورتِ آیاتِ رحمت
کہ جس دن سے ہوا برلوح مرقوم — شہادت پائیں گے حسنین مظلوم
ہے اس دن سے جگر پر داغ میرے — ہیں پیدا مثلِ نخلِ باغ میرے
اور اول واقعہ ایسا ہوا تھا — قلم نے لوح پر شرحا لکھا تھا
حسنؑ کو زہر سے ماریں گے ظالم — حسینؑ پر جفا کے ہو کے عازم
کریں گے کربلا میں ان کو حیراں — ہوا اس غم سے میرا سینہ بریاں

فقیہؔ نے شہادت آنحضرتؐ کو بڑی تفصیل سے نظم کیا ہے اور وفات سے قبل رسولؐ نے جو خطبہ دیا ہے اس کے اجزا کو بھی نظم کیا ہے۔ آخر میں اس مشہور واقعے کو نظم کیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات سے قبل جناب ام سلمہ کو ایک شیشی دی تھی جس میں کربلا کی خاک تھی اور یہ فرمایا تھا کہ جب یہ شیشی خون کی طرح سرخ ہو جائے تو سمجھنا کہ میرا حسینؑ شہید ہو گیا۔ فقیہؔ نے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

فقیہؔ اب قطع طولِ گفتگو کر — رجوعِ شرحِ رحلت مو بہ مو کر
رسولؐ اللہ کی رحلت کا بیاں کر — جہاں پر ابرِ غم کا سائباں کر
جب آئے وعظ کر مسجد سے اتمام — پڑا تب حضرت حسنینؑ کا کام
بلائے دونوں شہزادوں کو نزدیک — دمِ ہجراں کے بیماروں کو نزدیک
حسنؑ بااشکِ اخضر سبز در سبز — حسیناؑ اشکِ خونی رمز در رمز
سویوں روتے تھے جانزد پیمبرؐ — ہوے حاضر کہے اللہ اکبر
پکارے آہ واویلاہ نانا — ہمارے تم سوا کیا راہ نانا
یہ واویلاہ سن اصحاب سارے — سبھی یک لخت ہوکر آہ مارے
ہوا تھا اس قدر مجلس میں غوغا — بہ غم جنبش میں آیا عرش کبریٰ
سو شہزادوں کو حضرت نے بلائے — بہت حسرت سے چھاتی سے لگائے
ادھر حضرتؐ نے اپنا سر نمانا — ہوا جبریلؑ کا فی الحال آنا
سو آتے ہی محمدؐ مصطفٰے نے — کہے اس وقت فخرالانبیاء نے
اخی جبریلؑ تم بولو شتابی — پھریگا جبکہ یہ چرخ دوآبی
حسینا کو کہاں ماریں گے فاجر — بتانا مجھ کو بالتحقیق یکسر
سویوں جبریلؑ روکر بول اٹھے ہیں — بصد آہ و فغاں اتنا کہے ہیں

کہ ہے اک کربلا کا دشت محزوں — کہ وہ صحرائے دق ہے غم سے پرخوں
کہ اس صحرائے وحشت میں ہو مظلوم — رہے مقتول یہ شہزادہ معصوم
کہ قبل از وقت کے دن تین اکثر — رہیں تشنہ گرسنہ آل حیدر
دہم تاریخ ماہ محزن غم — جسے کہتا ہے سب عالم محرم
یہ سنتے ہی رسولؐ اللہ فرمائے — وہاں کی خاک کوئی اس وقت لے آئے
سووے ناموس رب العالمین نے — کہ یعنی آپ جبریلؑ امیں نے
وہ مشت خاک دشت کربلا سے — لے آئے جاکے فرمان خدا سے
کیے ہیں لاکے جب محفل میں حاضر — سبھی حاضر تھے انصار و مہاجر
سو حضرت نے وہ مشت خاک لیکر — مبارک دست سے شیشہ میں بھرکر
کہے اے شاہ مرداں شیر یزداں — رہے گی ام سلمہؓ تم تلک یاں
حوالے ان کے یہ شیشہ کرو تم — کہو ان کو کہ بہتر جا رکھو تم
یہی کہنا کہ اے عصمت کے معدن — کہ جس دن کو پھر آوے رنگ وروغن
کہ یعنی سرخ جب ہوویگی وہ خاک — کرو روز شہادت اس کے ادراک
پھر اس بعد از رسول اللہ وداع ہو — سبھی چھوٹے بڑوں سے الوداع ہو
غرض رحلت کے آگے شاہ مختار — محمدؐ مصطفٰے سالار احرار
بلائے پاس اپنے خانداں کو — سبھی ازواج عصمت کے نشاں کو
وداع یک یک سے ہو وہ شاہ والا — ہوے صاحب فراش و سربالا
فلک پر خورمی دنیا میں ماتم — فغان و آہ سے عالم تھا پرغم
صحابہ سب گریباں پھاڑ روئے — کہ دل میں تخم غم تاحشر بوئے
سو سب ہو متفق برامر فرماں — کیے تجہیز اور تکفیں کا ساماں

دیے ہیں غسل تب مولا علیؑ نے — یقیں شیر خدا حق کے ولی نے
کیے ہیں دفن خانہ عایشہ میں — بتاریخ دوازدہ نیک مہ میں
اول اردی بہشت و گل بگلشن — گیے جنت میں وہ جنت کے معدن
جہاں میں ایسا واویلا ہوا تھا — سبھوں کا غم سے دل میلا ہوا تھا
فقیہؔ تو اپنی جاں حضرت کے اوپر — قدومِ شافعِ امت کے اوپر
تصدق کرکے ایماں کو طلب کر — درود ان پر سدا مقبول رب

یہ شہادت نامہ مثنوی کے پیرایہ میں ہے اوراس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بمبئی میں شہادت ناموں کا کافی رواج تھا اور معتد بہ تعداد میں شہادت نامے یا مرثیے کہے اور پڑھے جاتے تھے۔ صبح عاشور امام حسینؑ اپنے مختصر سے لشکر کو کس طرح ترتیب دے رہے ہیں فقیہؔ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:۔

علم عباس علیؑ کو دے کے سلطاں — کھڑا سر پر لیے وہ فخر دوراں
علیؑ اکبر کو آگے کرکے سرور — تبھی سیدھی طرف قاسم کو رکھ کر
پس و پیش دگر ہم راست اور چپ — رکھے تھے شہسواراں لیکے خوش ڈھب
علم کرکر نشان احمدی کو — چلے لینے وہ تخت سرمدی کو
بہادر پہلوانان اہل اسلام — شہادت سے ہوئے تھے سرخ اندام
کھڑے صف کھینچ کر مردان کاری — چڑھی تھی سب کو وصلت کی خماری
صف شہدائے دین احمدی پر — وہ شہبازان ملک سرمدی پر
ہر اک مہرو جوان سروقد تھا — نوادر حسن میں خورشید خد تھا
مخالف فوج سے حر دلاور — ملا تھا شہ کو جو سردار رہ پر
کودا گھوڑے کو آیا شاہ دیں پاس — قدم پر گر گیا یا افضل الناس

تمہارے سے جو کوئی منکر رہے گا — یقیں گرداب ذلت میں پڑے گا
کہ یا ابن رسول اللہ مقبول — تمہارے پیش ہم ہوویں گے مقتول
تمہارے امتی ہوکر جفا کار — تمہیں چہتے ہیں پہنچانے کو آزار
کہا حر نے کہ اے شاہ غضنفر — میں اول سب سے چل آیا تھا تم پر
جہاں میں سب سے اول ہو کے قرباں — کراؤں سب کے تئیں دوزخ میں بریاں
کہے حضرت نے اے حر دلاور — صف جنگ کے بہادر زور آور
تو مہمان مکرم ہے ہمارا — تو مخلص اور ہمدم ہے ہمارا
ابھی کوئی اور جاوے گا بمیداں — کہاں حر نے کہ اے سلطان دوراں
کھٹکتا ہے مرے دل میں وہی غم — چلا تھا موذیوں میں سے مقدم
سواس باعث یہاں میں سب سے اول — تصدق ہو مروں اے شاہ افضل
کہے حضرت نے جا سونپا خدا پر — مدد تجھ کو سدا اللہ اکبر

''روضاۃ البکا'' کی تکمیل غلام علیؔ مہری نے کی تھی۔ یہاں ان کے بھی کچھ حالات درج کئے جاتے ہیں۔ غلام علی نام اور علیؔ تخلص تھا۔ بمبئی کے مشہور کوکنی خاندان مہری سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور شاعر قاضی غلام قاسمؔ مہری کے بھتیجے تھے۔ علیؔ نے کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ''مخزن الشعرا'' میں ان کا ترجمہ ان لفظوں میں ہے۔

''علیؔ تخلص شیخ علی مہری لقب، بمبئی کے رہنے والے ہیں اور وہاں کے مشاہیر شعرا میں سے ہیں۔(۷)

علیؔ کا پہلا کارنامہ ''روضاۃ البکا'' کی تکمیل ہے اس کے علاوہ انہوں نے اپنے چچا قاسمؔ کے تتبع میں مثنوی ''مصباح المجالس'' کے نام سے لکھی۔ یہ مثنوی سیرت رسول ﷺ سے متعلق ہے(۸)

علی نے دوسری مثنوی بزمیہ طرز پر لکھی ہے جو ''تحفۂ اعظم'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ۱۲۶۲ھ میں تصنیف کی گئی۔ یہ مثنوی اسی سال مطبع فضل الدین کھمکر مہمائی سے شائع ہوئی۔ ''تحفۂ اعظم'' ایک ضخیم مثنوی ہے۔ علی نے اس مثنوی کو ارکاٹ کے نواب غوث اعظم جاہی کے نام سے منسوب کیا تھا۔ جس کے صلہ میں نواب نے علی کو انعام واکرام سے نوازا۔ لیکن جب علی ارکاٹ سے بمبئی آرہے تھے تو راستے میں ڈاکوؤں نے انہیں لوٹ لیا اور یہ خالی ہاتھ لوٹے (۹)

علی مے ۱۲۸۶ھ میں ایک اور مثنوی ''منازل القمرین، شمائل البدرین'' تصنیف کی تھی۔ یہ مثنوی ۱۳۲۹ھ/۱۹۲۰ء میں مطبع رحمانی سے شائع ہوئی۔ اس مثنوی میں قصۂ حسن وعشق سعد وسلمٰی ہے۔

علی کا نعتیہ دیوان ''مدحت النبیؐ'' کے نام سے شائع ہوا تھا جو اب نایاب ہے۔ اس دیوان کی اکثر غزلیں مشکل زمینوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ نمونہ درج ہے:

جب نور نبیؐ عرش کے ایوان پہ چمکا — کرسی نے لیا چوم غبار اس کے قدم کا
جب نام محمدؐ کا لکھا عرش بریں پر — پر نور ہوا تارک اقبال قلم کا
رکھ حق نے ترے سر پہ عجب افسر لولاک — سالار کیا تجھ کو عرب اور عجم کا
یہ عرض علی کی ہے ترے خاک قدم سے — محتاج نہ کر مجھ کو کسی اور کے دم کا

غلام علی مہری نے ''تحفۃ الاحباب فی مناقب الاصحاب'' نام کی ایک کتاب نثر میں لکھی ہے جو وہابی عقائد کی رد میں ہے۔ یہ کتاب ۱۲۷۷ھ کی تصنیف ہے۔

علی کا تصنیف کردہ ایک مرثیہ بھی دستیاب ہوا ہے جو غزل کے فارم میں مختصر مرثیہ ہے لیکن اس کی زبان سلیس اور طرز بیان سادہ اور دلکش ہے۔ علی کے اس مرثیہ اور ''روضاۃ البکا'' کی دسویں مجلس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اور بھی مراثی کہے ہوں

گے۔ زبان پر ان کی گرفت ہے اور انہیں واقعات کو نظم کرنے کا بہترین سلیقہ ہے۔ مرثیے کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جارہے ہیں:

نیزے پہ ہے شبیرؑ کا سر راہِ خدا میں — مجرائی تہہ چرخِ قمر راہِ خدا میں
کونین کی دولت تھی جہاں نقش کف پا — لٹوا دیا شبیرؑ نے گھر راہِ خدا میں
گریاں غمِ فرزند میں آدمؑ رہے سو سال — شبیرؑ دے اکبرؑ سا پسر راہِ خدا میں
یاد آیا پسر نوحؑ کو طوفاں میں دمِ غرق — کیا سبطِ نبیؐ کا تھا جگر راہِ خدا میں
کیا زلفِ شہ دیں کو لکھوں اوجِ سناں پر — عنقائے الم کے کھلے پر راہِ خدا میں
ہفتاد دو تن اور لڑا لاکھوں سے شبیرؑ — ہمت پہ ذرا کیجے نظر راہِ خدا میں
عباسؑ کے مرنے پہ یہ غم تھا شہ دیں کو — ٹوٹے نہ کہیں میری کمر راہِ خدا میں
امت سے جفا حق سے رضا کی ملی دولت — شبیرؑ کو کیا حسبِ قدر راہِ خدا میں
جنت کی خریداری میں شبیرؑ کے غم میں — آنسو نہیں ہیں صرفِ گہر راہِ خدا میں
دربار میں خالق کے علی کی یہ دعا ہے — یہ مرثیہ ہو زادِ سفر راہِ خدا میں

جیسا کہ علی نے ''روضاہ البکا'' کے خاتمے میں لکھا ہے کہ مجھے فکر تھی کہ کوئی کتاب ایسی تصنیف کی جائے جو واقعہ کربلا پر محیط ہوتا کہ وہ محافل ومجالس میں پڑھی جائے۔ انہوں نے فقیہ کی کتاب ''روضاۃ البکا'' کو دیکھا لیکن اس میں شہادت امام حسینؑ کے متعلق مجلس کم تھی اس لئے انہوں نے اسے مکمل کیا۔ اس شہادت نامے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بمبئی میں اہلِ سنت والجماعت کے یہاں محافل اور مجالس کا عام رواج تھا اور یہاں کے حضرات اہل سنت اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان شہادت ناموں کے علاوہ بمبئی میں ایک اور رثائی صنف ''جھومر'' کا رواج تھا۔ بمبئی میں شبِ عاشور دنگل ہوتا تھا اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ دو ٹولیاں آمنے سامنے بیٹھ جاتی تھیں اور ایک دوسرے کے مقابل ہم قافیہ

وہم ردیف سلام پیش کئے جاتے تھے اور اس پر قید یہ ہوتی تھی کہ مستزاد کے شعر لگاتے چلے جائیں پھر اصل شعر پر لوٹ آئیں اس صنف کو ''جھومر'' کہا جاتا تھا۔ لیکن اس صنف کا کوئی مجموعہ راقم کی نظر سے نہیں گزرا لیکن بمبئی کے مطابع میں اس صنف کے مجموعے سے ضرور شائع ہوئے ہیں اگر چہ اس وقت ہم دست نہیں ہیں اگر کسی صاحب کو معلوم ہوں تو راقم کو مطلع کریں تا کہ اس رثائی صنف پر بھی کچھ کام کیا جائے۔

OOO

حواشی:

(۱) تاریخ طبع مثنوی روضاۃ البکا: ص:۴۵۴۔ زتصنیف فقیہ اہل کوکن سخندانوں میں ہے استاد پرفن
(۲) مخزن الشعرا: قاضی نورالدین فائق: ص:۹۲: اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۵ء
(۳) بمبئی میں اردو: ڈاکٹر میمونہ دلوی: ص۸۹ طبع ۱۹۷۰
(۴) بمبئی میں اردو: ص۹۰
(۵) بمبئی میں اردو: ص۹۱-۹۲
(۶) بمبئی میں اردو ص۸۸
(۷) مخزن الشعرا: ص۸۴
(۸) بمبئی میں اردو: ص۱۰۵
(۹) مخزن الشعرا: ص۸۴

حسینی درشن اور شفق شادانی

ہمارے ملک ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں امام حسینؑ کا سوگ دنیا کے ہر ملک سے زیادہ منایا جاتا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ لاکھوں ہندو، سکھ، پارسی، جینی اور عیسائی امام حسینؑ کو اس طرح مانتے ہیں اور ان کا اس انداز سے سوگ مناتے ہیں، جیسے امام حسینؑ ان کے اپنے ہیں۔ کشمیر سے کنیا کماری تک ہندوستان کے تمام مذاہب کے لوگ مل جل کر امام حسینؑ پر گریہ کرنے اور ان کا سوگ منانے میں برابر کے شریک ہیں۔ تعزیہ رکھتے ہیں، علم سجاتے ہیں، گریہ کرتے ہیں، ماتم کرتے ہیں اور مرثیہ پڑھ کر شہید انسانیت کے حضور خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور پھر یہ بات نہیں کہ ان پڑھ اور غیر مسلم عوام ہی امام حسینؑ کا سوگ مناتے ہیں۔ بڑے بڑے اہل علم دانشور بھی امام حسینؑ کا غم منانے میں برابر کے شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں غیر مسلم حسینی شعرا کی بڑی تعداد موجود ہے اور اردو ادب میں متعدد تحقیقی مقالے بھی پیش کئے جا چکے ہیں۔

ہندوستان میں متعدد قومی اور علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہندوستان کی شاید ہی کوئی زبان ہو جس میں امام حسینؑ پر مرثیے اور نظمیں نہ لکھی گئی ہوں۔ حسینی شاعر مرحوم نجم آفندی نے کہا تھا:

اس دیش کی آنکھیں بھی نجمی پیاسی تھی حسینی درشن کی
بھارت میں اجالا پہنچا ہے کربل میں درس دکھلایا تھا

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ امام حسینؑ اور حسینی درشن پر ہندوستان کی ہر زبان میں شاعری کی گئی ہے۔ ہندی ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ تقسیم سے قبل ہندوستانی عام ہندوستانیوں کی زبان تھی لیکن تقسیم کے المیے نے دلوں کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی تقسیم کر کے ہندی اور اردو کو دو الگ الگ شکل دے دی جس کا اثر حسینی شعریات پر بھی پڑا۔ امیر خسرو سے لے کر آج تک ہندوستان میں جو ادب تخلیق کیا گیا وہ بذات خود بہت اہم ہے۔ کبیر داس کے دوہوں سے لے کر نجم آفندی کی ہندی شاعری تک جو ہندی ادب ہمارے سامنے ہے وہ کسی طرح اردو زبان کی حسینی شاعری سے کم نہیں ہے۔

جس طرح اردو زبان میں حسینی شعریات کا وافر ذخیرہ موجود ہے اسی طرح ہندی ادب میں بھی حسینی شعریات اتنی زیادہ ہے جن کی گنتی نہیں کی جا سکتی، یہ الگ بات ہے کہ ہندی کے محققین نے اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندی کے محققین بھی حسینی شعریات اور درشن پر خصوصی توجہ دیں تا کہ حسینی شعریات کو بھی ہندی ادب میں جائز مقام مل سکے۔

امام حسینؑ کی ذات اور ان کا درشن اس لئے قابل توجہ ہے کہ امام حسینؑ نے دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد یزید کو جو اپنی حکومت اور طاقت کے زعم میں اپنے آپ کو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تشدد، ظلم اور بربریت کے آگے مجبور ہو کر دنیا کا ہر انسان میرے سامنے جھک جائے گا لیکن امام حسینؑ نے اپنی بے سروسامانی اور صبر و استقامت کے ذریعہ اس دہشت گرد یزید کو ایسا منھ توڑ جواب دیا کہ امام حسینؑ صبر، امن، سلامتی، ایثار اور قربانی اور یزید ظلم، بربریت اور دہشت کی علامت بن گیا اس طرح امام حسینؑ نے اپنی قربانی پیش کر کے اسلام کی سچی تصویر پیش کرتے ہوئے بتایا کہ میرے نانا کا لایا ہوا دین اسلام سچائی، پریم، ایثار اور قربانی کا مذہب ہے۔ ہندوستانیوں سے امام حسینؑ کا تعارف کراتے ہوئے شفق شادانی

کہتے ہیں:

ان کی رچنا ہوئی ہے مانو جاتی کے کلیان کو
بھارت واسی پڑھ کے دیکھیں گیتا اور قرآن کو

شفق شادانی کا خیال ہے کہ اگر کربلا کی قربانی اور اس کے درشن سے سبق لیا جائے تو ہماری ملکی سالمیت اور قومی یکجہتی کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کربلا انسانیت اور قومی ایکتا کی بہترین تربیت گاہ ہے۔ کربلا کے اسی پیغام کو شفق شادانی کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں:

دنیا والو! گلے لگاؤ کربل کے بلیدان کو
دھرتی بانٹی، ساگر بانٹے، مت بانٹو انسان کو

حسینی درشن کو اپنی شعریات کا حصہ بنانے والوں میں شفق شادانی ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں اردو اور ہندی دونوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل ہے۔ اردو ہی کی طرح ہندی کے ذریعہ بھی وہ حسینی درشن کو عوام الناس تک پہنچانے میں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں:

میں کربلا کے اجالوں میں جی رہا ہوں شفق
یہ میری فکر یہ میرا قلم حسینؑ کے نام

شفق شادانی کی شاعری زیادہ تر کربلا اور حسینی درشن کے ارد گرد گھومتی ہے اور انہوں نے نجم آفندی کی طرح اردو کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کو بھی اپنی شاعری کا ذریعہ بنایا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی ہندی شاعری میں ان کا خلوص عقیدت اور بھی زیادہ نکھر کر آتا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ ہندی زبان کی سادگی، اس کی شیرینی اور اس کی جاذبیت، خاص کر نوجوان نسل کی اردو سے بے رُخی نے اس خصوصیت کو اور زیادہ شدید کر دیا ہے۔ چونکہ شفق شادانی کی شاعری کا اصل مقصد حسینیت کی تبلیغ تھی اس لئے انہوں نے بہتر سمجھا کہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کو اس کا ذریعہ بنایا جائے۔

شفقؔ شادانی کواس بات کا یقین ہے کہ امام حسینؑ کی قربانی اوران کے درشن کوسمجھ کر ساری دنیا کے لوگ چاہے وہ کسی بھی دھرم کے ماننے والے ہوحق و باطل کی تفریق کر سکتے ہیں اسی لئے انہوں نے ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے یہ محسوس کیا کہ ان کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ ہندوستان کی اکثریت کواسلام کی اس دکھ بھری کہانی (واقعۂ کربلا) سنائیں اوراس کیلئے ہندی زبان ہی صحیح ذریعہ ہے۔ شفقؔ شادانی اسی لئے گنگا اور جمنا کے دھاروں کو کوثر سے ملانے کی بات کرتے ہیں:

بھارت ماتا کے بیٹے پیاسے ہیں حسینی درشن کے
کوثر تک پھیلادو گنگا جمنا کے ارمان کو

شفقؔ شادانی نے اپنی شعریات میں حسینی درشن کو پیش کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ حسینی درشن انسانوں سے پریم، خدمت خلق، خودسپردگی اور قربانی کا سبق دیتا ہے۔ شفقؔ نے یہ بھی بتایا ہے کہ امام حسینؑ کو رضائے خدا کے آگے سپردگی اور قربانی کا جذبہ اپنی ماں بی بی زہراؑ سے وراثت میں ملی تھی۔

تن من دھن اور جو بھی ایشور کو سمرپن کرتی ہیں
پوجا کی انتم اونچائی سجدہ بی بی زہرا کا

سپردگی (سمرپن) ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ اللہ کی مرضی ملتی ہے اوراسی کے ذریعہ انسان کومعراج حاصل ہوتی ہے:

بندے کا اللہ سے رشتہ سجدے اور بلیدان
مرد مومن کا سرمایہ سجدے اور بلیدان
پیار، سمرپن ، درشن، جلوہ سجدے اور بلیدان
انسانی معراج کالحہ سجدے اور بلیدان

اوراس قربانی اور سمرپن کی بہترین مثال امام حسینؑ نے کربلا کے میدان میں پیش کی ہے اور شفقؔ شادانی کے نظریہ کے تحت یہ بلیدان اور سمرپن اس یقین کی وجہ سے ہوتا ہے جسے اللہ کی بندگی کہتے ہیں اور امام حسینؑ نے دنیا کے سب سے مشکل امتحان میں وہ کامیابی حاصل کی کہ حسینی درشن ہی اسلامی درشن بن گیا۔

اپنا سب کچھ سونپ دیا ہے چھری تلے اک سجدے میں
اوتاروں، نبیوں جیسا وشواس ہے کربل نگری میں
ٹوٹ گئے ہیں بکھر گئے ہیں کچل گئے ہیں دھرتی پر
سر کو اونچا رکھنے کا احساس ہے کربل نگری میں

شفقؔ شادانی کے مطابق امام حسینؑ تسلیم و رضا کی اس منزل پر ہیں جہاں پر پہنچنا سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ حسینی درشن کی امرت دھارا کا متلاشی یہ شاعر ہندی تلمیحات کا بھی سہارا لیتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ جس درشن کے ہم مبلغ ہیں اصل میں اس کا سرا کرشن، گوتم اور شنکر تک جاتا ہے:

سجدے میں خنجر کے تلے شبیر نے وہ امرت پایا
کھوج میں جس کی کرشن رہے اور گوتم شنکر ڈوب گئے

شفقؔ شادانی کی ہندی شاعری میں فکر کی گہرائی و گیرائی کی پختگی کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی اور واقعۂ کربلا کے محرکات و اسالیب کی پیش کش انہیں انفرادی حیثیت عطا کرتی ہے۔ نیز ہندی الفاظ اور محاوروں پر ان کی گرفت سے احساس ہوتا ہے کہ انہیں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی زبان پر بھی بے پناہ قدرت حاصل ہے اور کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شفقؔ کی ہندی شاعری ان کی اردو شاعری پر بھاری پڑ رہی ہے:

سنگم ہندستانی تہذیب کی ایک ایسی علامت ہے جہاں ہندوستان کی تین مقدس

ندیاں ملتی ہیں اور اسے ہماری ایکتا کی علامت کے طور پر پہچانا جاتا ہے لیکن شفق شادانی نے کربلا کو بھی سنگم کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ہندوستانی سنگم جہاں تین ندیوں گنگا، جمنا اور سرسوتی کا ملن ہے وہیں کربلا ایک ایسا سنگم ہے۔ جو دھرموں اور وشواسوں (یقین) کا سنگم ہے:

کربل نگری میں سنگم ہے دھرموں اور وشواسوں کا
انسانوں کے بیچ گرانے نفرت کی دیوار چلی

یعنی کربلا ایسا سنگم ہے جو نفرت اور دشمنی کو ختم کر کے ہر دھرم، ہر نسل، ہر قبیلہ کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کر دیتی ہے۔ چونکہ کربلا ایک ایسی کہانی ہے جسے سن کر انسان کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ کربلا کے درشن کی ہندوستانی مقدس ندیاں گنگا جمنا بھی پیاسی ہیں:

آشاؤں کے دیپ جلائے تو نے فرات کی موجوں پر
تیرے درشن کے پیاسے گنگا جمنا کے دھارے بھی

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ کربلا کسی کو ناامید نہیں کرتی۔ اس کے دامن میں جو بھی آ گیا وہ انسانیت، اخوت اور بھائی چارگی کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ ذیل میں ہم شفق کی ہندی شاعری کی کچھ مثالیں پیش کر رہے ہیں جس میں پنگھٹ، ساگر منتھن، کوثر منتھن، پتوار، ناؤ، لہو کا ساگر، نیل کمل جوالا مکھی، آرتی، جگنو، پگڈنڈی، دھنک، شردھانجلی، گیت، شہنائی، راج محل، شیش محل، سمراٹ، سنگھاسن اور آکاش گنگا جیسے الفاظ و علامت سے حسینی درشن کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے:

پھر بھی اے شبیر تری آکاش کی گنگا روشن ہے
جانے کتنے سورج کتنے چاند ابھر کر ڈوب گئے

☆☆☆

اک صبر نے قتل عام کیا جیون بھر کی چنتاؤں کا
اس پیاس کے جلتے ساگر میں پنگھٹ ہے نئی آشاؤں کا
پیاسوں کی یادوں میں نکلی آنسو کی اک بوند شفق
ساگر منتھن جیت گئی اب کوثر منتھن مانگے ہے
کٹے ہوئے ہاتھوں کا سندیسہ ساحل ساحل گونجے گا
ہمت کو پتوار بنا لو ڈوبی نیّا پار کرو
سب کے دکھوں کا اپنے لہو کا ساگر پی کر ہنستے ہیں
جنم جنم کی مسلی کچلی پیاس ہے کربل نگری میں
ویروں شہیدوں بلوانوں کو دینا ہے شر دھانجلی
حق پہ مرنے والوں کے سپنے کرنے سا کار چلیں
اپنی دعاؤں میں لے لو زہراؑ کے گلابوں کی خوشبو
کھل جائیں گے آشاؤں کے نیل کمل آسانی سے
پوجا کے نرمل ساگر میں جیسے کمل لہرائے
ایسا مالک ایسا مولا ہر دے میں بس جائے
سمراٹوں کے محلوں میں عباس کا جھنڈا لہرا دیں
ظالم کے درباروں میں قیدی کرنے دربار چلے
یہ تخت یہ تاج یہ راج محل سب کو دینے بنواس چلا
زنجیروں میں سجا د چلے، پیچھے پیچھے اتہاس چلا
سپنوں سے آباد ہمارا دھرم نگر و شواس نگر
بلیدانوں کے شیش محل میں چودہ درپن مانگے ہے

درج بالا اشعار کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شفقؔ شادانی نے اپنی ہندی شاعری میں حسینی درشن کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے اور ان کی اس پیش کش میں ان کی اس عقیدت کا بڑا حصہ ہے جو انہیں اسلام، رسولؐ و آل رسولؐ خصوصاً شہید انسانیت امام حسینؑ سے ہے۔ اور حسینی درشن کو عام لوگوں تک پہنچانے کے جذبے نے شفقؔ شادانی کو ہندی کا ایک اہم شاعر بنا دیا ہے۔ شفقؔ نے حسینی درشن کی سب سے اہم کڑی صبر اور عدم تشدد کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اس لئے وہ ہر انسان کو اس کی تلقین کرتے ہیں:

اپنے دکھ پر صبر کروں اور یہ بھی مجھے وردان ملے
جس کی ہمت ٹوٹ گئی ہے اس کی آس بندھاؤں میں

شفقؔ شادانی کے مطابق جب انسان ہر طرف سے ناامید ہو جاتا ہے تو کربلا اسے اللہ کے در پر جھکنے اور صبر و شکر کا سبق دیتی ہے:

بھرے پرے سنسار کے اندر میرا دامن خالی ہے
کس کے آگے ہاتھ پساروں جب تیرا کہلاؤں میں
کھیت اور جنگل، جھرنے ساگر پروت سورج اور آکاش
سب میں تیرے جلوے دیکھوں تجھ میں ہی کھو جاؤں میں

یہاں پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شفقؔ شادانی نے اپنی شاعری کو حسینی درشن کا موضوع دے کر بڑی سمجھداری سے کام لیا ہے اور ہمیں ان کی اس سمجھداری کا قائل ہونا پڑے گا کیونکہ شفقؔ شادانی کی یہ شاعری آج بھی امام حسینؑ کے پیغام اہنسا، ایکتا، پریم اور انسانیت کی فلاح و بہبود کا سبق دے رہی ہے:

رام کہو رحمان کہو دونوں ہیں اسی کے نام شفقؔ
ہم سب مل کر سورگ بنا دیں اپنے ہندوستان کو

کربل کی آواز نہ باندھو ذات اور پات کے بندھن سے
رہ نہ سکے گا یہ سورج اونچی نیچی دیواروں میں
دھرموں کے بندھن ٹوٹ گئے تو ایک نرالا دھرم بنا
شبیر کے دوار پہ بچھڑی ہوئی سب آدم کی سنتان ملی
دھرم ہمارا کہتا ہے تم دشمن سے بھی پیار کرو
پیار کی خوشبو سے مہکا دو نفرت کے شمشان کو

شفقؔ شادانی کے درج بالا اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے امام حسینؑ کے درشن کو بڑے سلیقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہماری زندگی اسی وقت کامیاب زندگی کہلائے گی جب ہم جنگوں، ہتھیاروں اور دہشت گردی کو چھوڑ کر اہنسا، ایکتا، پریم اور انسانیت کے راستے پر گامزن ہوں:

میں نے شفقؔ وشواس کیا ہے اک انجانے جیون پر
جب انسانی نسل نہ ہوگی جنگوں اور ہتھیاروں میں

○○○

عشرتؔ لکھنوی کے مرثیوں کی سماجیات

لکھنوی ادب انیسؔ و دبیرؔ سے عبارت ہے۔ یہ اس لئے کہ لکھنوی ادب میں جہاں مثنوی، غزل، قصیدہ نے عروج حاصل کیا وہیں مرثیے نے اس شہر میں وہ معراجِ کمال حاصل کیا کہ مرثیہ لکھنؤ کی شناخت بن گیا۔ لکھنؤ نے ہر دور میں ماحول کے مطابق مرثیوں میں اجتہادات کیے اور اس میں جدّت پیدا کر کے جوشؔ، آلِ رضا اور نسیمؔ امروہوی جیسے فنکاروں کی تربیت کر کے جدید مرثیے کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں جدید مرثیے میں فلسفہ و سائنس کو چہرے میں پیش کر کے پروفیسر وحید اختر نے ایک نیا راستہ دکھایا حالانکہ اس سے قبل جمیلؔ مظہری نے اپنے مرثیوں میں فلسفے کو جگہ دی تھی لیکن وحید اختر نے مزید نئے تجربے کر کے جدید مرثیے کو نئے آہنگ سے روشناس کرایا ان کے دوش بدوش مہدیؔ نظمی اور منظر عباس نقوی نے اپنے مرثیوں میں نئے نئے تجربے کیے۔ عشرتؔ لکھنوی ان مرثیہ نگاروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے سائنس اور فلسفہ سے الگ ہٹ کر اخلاقی اقدار کو اپنے مرثیوں میں نمایاں جگہ دی۔ وہ شہرِ سخن لکھنؤ کے پروردہ ہیں انھوں نے سلام، منقبت اور نوحہ گوئی میں نام پیدا کیا۔ استادِ گرامی سید افضل حسین کیفیؔ رضوی کا یہ سپوت کچھ ہی دنوں میں اپنی صلاحیت کے بنا پر لکھنوی ادب کا نمائندہ بن گیا۔ پہلے 'تسبیح عزا' عزائی ادب میں برکت کا سبب بنا اور پھر 'اشکوں کی زباں' عزاداروں کا ترجمان بن کر حسینی شعریات کا حصہ بنا اور اب 'فراتِ غم' ملّت گریہ کن کے لئے بیداری کا سبب بن رہا ہے۔ زیرِ نظر سطور میں

عشرتؔ لکھنوی کے مرثیوں کی سماجیات پر گفتگو کی جارہی ہے۔

عشرتؔ ایک ایسے سماج کے متمنی ہیں جو مذہب اہلبیت یعنی فلاح انسانی کا پیروکار ہو۔ حدیث رسولؐ ہے کہ نماز دین کا ستون ہے۔ عشرتؔ کا خیال ہے کہ ہر شخص کو نماز کا پابند ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ حدیثِ پیغمبرؐ کے مطابق نماز ایک ایسا عمل ہے کہ یہ قبول تو سارے اعمال قبول اور اگر یہ قبول نہیں ہوئی تو سارے اعمال بارگاہِ الٰہی میں رد کر دیے جائیں گے۔ اس لئے عشرتؔ اپنے مرثیہ 'نماز اور حسینؑ' میں بچوں کو نماز کے لئے متوجہ کرتے ہیں:

بچو کبھی نماز سے غافل نہیں رہو — دنیا کی لذتوں سے نہ خود کو فریب دو
اسلام کی بتائی ہوئی راہ پر چلو — تم وقف کر دو حق کے لئے پانچ وقت کو
بچپن کا ذوق بڑھ کے جوانی تک آئے گا
دیکھے گا جب بھی تم کو خدا مسکرائے گا

عشرتؔ کی نظر میں 'مستقبلِ حیات کا محور نماز ہے'۔ اس لئے وہ ایسے سماج کے خواہشمند ہیں جن کی مائیں اپنے بچوں کو نماز کا عادی بنائیں۔ یہ سماج شریعت کے سائے میں ماں کی لوریوں میں پلتا اور بڑھتا ہے:

ماں لوریوں میں بچوں کو سورے سناتی ہے — پہلے فروع دین کا شربت پلاتی ہے
کھلتی ہے جب زبان تو کلمہ سناتی ہے — بچپن ہی سے نماز کا عادی بناتی ہے
احسان ہے یہ ہم پہ خدائے کریم کا
ماں پہلا مدرسہ ہے صلوٰۃ عظیم کا

اور جب یہ لوریاں نماز کے ساتھ عزائی سماج کا حصہ بنتی ہیں تو عشرتؔ کے مطابق ہر عزادار نمازی ہو جاتا ہے چونکہ عزائی سماج کا ہر بچہ نمازی ہوتا ہے اس لئے یہ نماز ہر عزادار کو مستقبل حیات کا معمار بنا دیتی ہے۔ عشرتؔ کا خیال ہے کہ یہ عزائی سماج اس اذان کا

صدقہ ہے جو ہم شکلِ پیغمبرؐ حضرت علی اکبر نے صبحِ عاشور بلند کی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ عزائی سماج کے نونہالوں کی بیدار کن صدائے اللہ اکبر سے اب مسجدیں جوانوں سے آباد نظر آ رہی ہیں۔ اس لئے اس سماج میں عشرتؔ یہ نہیں چاہتے کہ کوئی شخص بے نمازی کہا جائے۔

اچھا نہیں کہ غیر نمازی کوئی کہے　　سچ بات پر ہماری اگر کچھ برا لگے
بہتر ہے خود ہی چھوڑ دو غفلت کے راستے　　بخشیں گے تم کو بس یہی سجدے نماز کے
سجدے میں گر خلوص سے سر کو جھکائے گا
یہ ماتمِ حسینؑ تجھی کام آئے گا

عشرتؔ کا تصوراتی سماج جس میں:

روزہ بھی ہو نماز بھی ہو اور عزا بھی ہو　　کعبہ بھی ہو نجف بھی ہو اور کربلا بھی ہو
تسبیح بھی مصلیٰ بھی ہو تعزیہ بھی ہو　　غم کا سرور بھی ہو خوشی کا مزا بھی ہو
سب کچھ اگر ہے ساتھ تو اچھی حیات ہے
ورنہ تمھاری دشمنِ جاں کائنات ہے

عشرتؔ اس بات سے بے حد رنجیدہ ہیں کہ کچھ لوگ اپنے آپ کو عزائی سماج کا پروردہ کہتے ہیں لیکن وہ نماز سے غافل ہیں۔ ان کی یہ غفلت عشرتؔ کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہر دور میں بوجہل و بولہب اپنے مشن پر گامزن ہیں اس لئے موجودہ عہد کے بوجہلوں سے اپنے سماج کو بچانا چاہئے:

ہر دور میں کھلے ہوئے بوجہل سے بچو　　جس راہ پر عمل نہ ہو وہ راہ چھوڑ دو
اسلام پڑھ کے جامۂ تہذیب میں رہو　　آواز دے رہی ہے تمہیں کربلا اٹھو
جینا ہے شان سے جو تمہیں کائنات میں
داخل کرو نماز کتاب حیات میں

عشرتؔ کا ایک مرثیہ 'حقوقِ والدین' ہے۔ جس میں عشرتؔ نے جن مسائل پر گفتگو کی ہے ان کا ہماری زندگی اور ہمارے سماج سے گہرا تعلق ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارے سماج اور اخلاقی اقدار کی گراوٹ اور رشتوں کی ناقدری ہمارے سماج میں بگاڑ کا سبب ہے۔ تہذیب و تمدن گذرے وقت کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ قدروں کے انحطاط اور تہذیب کی ناقدری کا عشرتؔ کو شدید احساس ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آج اسی کی قدردانی ہے جو سیاسی بازیگر ہو۔ اب نہ تہذیب کی باتیں ہیں نہ کردار کی باتیں ہیں:

دنیائے مسائل میں ہے الجھا ہوا انسان　　جس پر بھی نظر ڈالتے ہیں بے سروسامان
اس درجہ تمدن کا زمانے میں ہے فقدان　　کب اپنے کئے پر کوئی ہوتا ہے پشیمان
تہذیب کی باتیں ہیں نہ کردار کی باتیں
منھ دیکھ کے کر لیتے ہیں سب پیار کی باتیں

عشرتؔ سماج میں پھیلی ہوئی منافرت سے بہت نالاں ہیں۔ وہ فرقہ پرستی کو سماج کے لئے زہر ہلاہل سمجھتے ہیں۔ انھوں نے سماج کے ان ناسوروں سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے جو سماج میں بگاڑ تو پیدا کرتے ہیں لیکن عام لوگ انھیں صاحب کردار سمجھتے ہیں۔ سماج کے ان ناسوروں کے حوالے سے یہ بند قابلِ توجہ ہیں:

ایسے بھی ہیں کچھ دور ترقی کے پرستار　　جو فرقہ پرستی کی اٹھا دیتے ہیں دیوار
باتوں سے تو لگتے ہیں بڑے صاحب کردار　　رکھتے ہیں مگر میان میں تفریق کی تلوار
یہ چاہے جہاں جائیں وہاں آگ لگا دیں
اٹھنے لگے شعلے تو انھیں اور ہوا دیں

آباد ہے بس ایسے ہی لوگوں سے زمانا　　جن لوگوں کے ہونٹوں پہ ہے نفرت کا ترانا
جن لوگوں کا پیشہ ہے فقط آگ لگانا　　جو ڈھونڈتے رہتے ہیں تشدد کا بہانا

ان لوگوں کی دنیا میں بہت آؤ بھگت ہے
جن لوگوں کے اعمال سے بدنام جگت ہے

عشرتؔ کا خیال ہے کہ ایسے متنفی اور بدتہذیب لوگ وہ لوگ ہیں جو اپنے والدین کی عزت نہیں کرتے۔ وہ لوگ چونکہ اپنے والدین کا احترام نہیں کرتے اس لئے ان کے دلوں میں سماج کے کسی فرد کے لئے جذبۂ احترام نہیں ہوتا۔ انھوں نے سماج میں بگاڑ کی اصل وجہ والدین سے بے رخی کو بتایا ہے۔ اس لئے کہ جو اپنے گھر میں آگ لگا لیتے ہیں وہ سماج کے ہر گھر میں آگ دیکھنا چاہتے ہیں اور والدین کی نافرمانی کا نتیجہ ہے کہ آج ہر آسائش ہونے کے باوجود لوگوں کو سکون میسر نہیں ہے:

وہ فکر میں گرمی وہ مزاجوں میں تمازت　　وہ لوگ جو کرتے نہیں ماں باپ کی عزت
جو عیب سمجھتے ہیں بزرگوں کی اطاعت　　نقصان اٹھاتی ہے انہیں لوگوں سے ملّت
جو کہتے ہیں ہم فرد ہیں ہر ایک ہنر میں
وہ آگ لگا لیتے ہیں خود اپنے ہی گھر میں

آتا ہی نہیں بیٹھنے اٹھنے کا سلیقہ　　ہم بھول گئے اپنے بزرگوں کا طریقہ
مصروف غلامی میں ہے ہر ایک دقیقہ　　کرتے ہیں بڑی شان سے بچوں کا عقیقہ
ماں باپ کو دینے کے لئے مال نہیں ہے
ہم میں کوئی اس واسطے خوشحال نہیں ہے

سماج کی کڑوی سچائی ہے کہ جن لوگوں نے والدین کی قدر نہیں کی زمانہ اسے ناقدری کا شکار بنا لیتا ہے۔ عشرتؔ کا خیال ہے کہ والدین کے تعلق سے قرآن میں اتنا صریحی حکم ہونے کے باوجود لوگ والدین کے مقابل بیوی کی خواہشات کا احترام کرتے ہیں۔ اس تناظر میں ذیل کا بند دیکھیں:

احکام الٰہی سے جو کرتے ہیں کنارا　　ہوتا نہیں دنیا میں کوئی ان کا سہارا
برباںگ دہل کہتا ہے اسلام ہمارا　　کر سکتے نہیں وہ کبھی جنت کا نظارا
ماں باپ کو جو چھوڑ گئے زن کی خوشی میں
ان لوگوں کے دن ڈوب گئے تیرہ شبی میں

عشرتؔ نے اپنی سماجیات کو مرتب کرنے میں جگہ جگہ قرآن وحدیث سے استنباط کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قرآن سے بے اعتنائی نے ہماری سماجی قدروں کو سولی پر چڑھا دیا ہے:

اف کرنا بھی ماں باپ سے اچھا نہیں ہوتا　　ہاں خوف مگر ہم کو خدا کا نہیں ہوتا
قرآن جو پڑھ لیتے تو ایسا نہیں ہوتا　　جو اچھا ہے دنیا میں وہ رسوا نہیں ہوتا
جب تک کہ زباں سورۂ توبہ نہ پڑھے گی
تہذیب ہمیشہ یوں ہی سولی پہ چڑھے گی

عشرتؔ نے اپنے مرثیے میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ہمارے سماج کے زیادہ تر لوگ غافل ہیں۔ ایک طرف تو دنیا میں لوگ والدین کا احترام نہیں کرتے دوسری طرف کچھ لوگ احترام تو کرتے ہیں لیکن دنیا سے گذر جانے کے بعد والدین کو بھول جاتے ہیں۔ عشرتؔ کا خیال ہے کہ ہمارے سماج میں والدین کا سوئم، چالیسواں تو ہوتا ہے لیکن بعد میں لوگ انھیں ایصال ثواب کرنا بھول جاتے ہیں۔ اس صورت حال کی عکاسی عشرتؔ نے بڑے موثر انداز میں کی ہے:

ماں باپ ہیں بچوں کے لئے سایۂ رحمت　　ماں باپ کی ہر حال میں واجب ہے اطاعت
وہ لوگ جو ماں باپ کی کرتے نہیں عزت　　اللہ بھی کرتا نہیں ان لوگوں کی نصرت
اللہ کی مرضی پہ جو سر خم نہیں ہوتے
انسان تو ہوتے ہیں مکرم نہیں ہوتے

عشرتؔ کی نظر میں والدین اپنی اولاد کے لئے سایۂ رحمت ہیں اس لئے اخلاقی فریضہ ہے کہ ہر شخص اپنے والدین کی اطاعت کرے۔انھوں نے پیش کی کہ جولوگ والدین کی عزت نہیں کرتے اللہ بھی ان کی مدد نہیں کرتا۔عشرتؔ چونکہ ایک صالح سماج کی تشکیل و تعمیر کے متمنی ہیں اس لئے وہ متوجہ کرتے ہیں کہ جولوگ اللہ کی رضا پر اپنے سر کو خم نہیں کرتے وہ انسان جیسے دکھائی تو دیتے ہیں لیکن اصل میں وہ حیوان ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ صاحبِ عزو شرف نہیں ہوتے۔والدین پروردگار عالم کے رحم وکرم کی بہترین مثال ہیں۔جس طرح اللہ اپنے بندوں کو کسی حال میں بھی نہیں بھولتا اور اس کا فضل وکرم ہر حال میں شاملِ حال رہتا ہے اسی طرح والدین دنیا سے جانے کے بعد بھی اپنے بچوں کو دعائیں دیتے ہیں:

اللہ نے ماں باپ کو بخشا ہے یہ رتبہ
ماں باپ بھی ہوتے ہیں شفاعت کا ذریعہ
مرجاتے ہیں ماں باپ تو کر لیتے ہیں گریہ
چالیسواں ہو جائے تو پھر کیسا فریضہ
ٹوٹی ہوئی قبروں سے صدا دیتے ہیں ماں باپ
ہم کچھ نہ سنیں پھر بھی دعا دیتے ہیں ماں باپ

اتنا ہی اگر سوچ لو بن جاؤ گے انسان
دنیا میں کبھی ہو نہیں سکتے ہو پریشان
گر پیشِ نظر رکھو گے ماں باپ کا احسان
رکھے گا تمہیں سایۂ اسلام میں قرآن
تم نیک بنو گے تو خدا شاد رہے گا
بن جاؤ گے اچھے تو گھر آباد رہے گا

اللہ کی بھیجی ہوئی تنویر ہیں ماں باپ
بچوں کے لئے جاگتی تقدیر ہیں ماں باپ
اجمال محبت تری تفسیر ہیں ماں باپ
جو مسخ نہیں ہوتی وہ تصویر ہیں ماں باپ
چہرے کے خدو خال ہیں جنت کا نمونہ
ماں باپ کی تخلیق ہے قدرت کا نمونہ

عشرتؔ کا ایک مرثیہ 'دوستی کا اس قدر دنیا میں بدلا ہے اصول' ہے۔جس میں انھوں نے دوستی کی ناقدری اور سماج میں دوستی کے نام پر جس طرح بے وقوف بنایا جاتا ہے اس دوستی کا ذکر کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ ہمارے سماج میں سادہ لوح اور سیدھے سادے لوگوں کو دوستی کے نام پر دھوکہ دیا جاتا ہے اور اس طرح دوستی کا نام بدنام کیا جاتا ہے۔دراصل ایسے لوگ دوستی کی آڑ میں دشمنی کرتے ہیں جس کی وجہ سے سماج میں اخوت و بھائی چارگی، محبت اور ایثار وقربانی کا جذبہ ختم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔عشرتؔ کہتے ہیں:

دوستی کا اس قدر دنیا میں بدلا ہے اصول — دوستی دیتی ہے تحفے میں ہمیں کاغذ کے پھول
آج کل ہے دوستی کا تذکرہ کرنا فضول — دوستی کرتی ہے سو سو بار ہر دل کو ملول
دوستی نفرت کے میلے پیرہن میں آ گئی
دوستی بدنام کرنے انجمن میں آ گئی

دوستی اس دور میں کاغذ کی زینت بن گئی — دوستی اس دور میں لعنت ہی لعنت بن گئی
دوستی اس دور میں وجہ مصیبت بن گئی — دوستی اس دور میں لفظ شکایت بن گئی
دوستی کا نام سن کر لوگ گھبرانے لگے
دوستی کو دن میں اب تارے نظر آنے لگے

آج پوری دنیا میں افراتفری کا ماحول ہے۔ پیار، محبت، خلوص اور بھائی چارگی جیسی قدروں کا فقدان ہے۔ ہر طرف دہشت و بربریت کا بازار گرم ہے۔ ہمارا سماج مذہبی ،مسلکی اور لسانی تعصّبات کا شکار ہے اور ہمارے سیاست داں دوستی کے بجائے نفرت کا بیج بو رہے ہیں۔ ووٹوں کی سیاست نے ہمیں دوستی سے دور اور نفرت کے قریب کر دیا ہے۔عشرتؔ نے اس صورت حال کی بہترین عکاسی کی ہے:

راستہ دہشت گری کا چن چکی ہے دوستی　　آئینوں کے شہر میں پتھر بنی ہے دوستی
دوستی ایسی ہے تو کس کام کی ہے دوستی　　کل تھی اچھی آج تو کھلنے لگی ہے دوستی

گھر سے باہر تک یہی چرچا سمجھداروں میں ہے
دوستی کا نام اب نفرت کے بازاروں میں ہے

ہوگئی جس روز سے گندی سیاست کا شکار　　چھن گیا ہے پیکرِ تہذیب کا صبر و قرار
مفلسوں کے پیٹ پر پڑنے لگی فاقوں کی مار　　مر رہے ہیں بھوک سے غربت کے مارے بے شمار

دوستی کے نام پر ووٹوں کی دولت لے گئے
کامیابی مل گئی تو سب کو دھوکا دے گئے

عشرتؔ چونکہ اس سماج کے فرد ہیں جہاں کی تہذیب کو گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں۔ اس سماج میں عشرتؔ کو شرافت، تہذیب اور اخلاقی اقدار یہ سب الفاظ گذرے زمانے کی باتیں محسوس ہونے لگی ہیں۔ قدروں کے زوال اور عدل و انصاف کا نہ ہونا شاعر کا ایسا درد ہے جو عشرتؔ کو بار بار درد کی ٹیس کے ساتھ طنز کرنے پر مجبور کرتے ہیں اس طنزیہ گفتگو میں وہ الفاظ کو پر اثر بنانے کے لئے محاوروں کا استعمال بھی بخوبی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

دوستی آفت کی پڑیا دوستی ننگا سماج
دوستی ہے وقت کے ماتھے پہ اک کانٹوں کا تاج

ہم خلاف دوستی کس سے کریں گے احتجاج
جتنے بھی منصف ہیں سب کے سب بکے بیٹھے ہیں آج

جھوٹ کی آبادیوں پر حکمرانی ہو گئی
شرم سے سچوں کی دنیا پانی پانی ہو گئی

عشرتؔ کا خیال ہے کہ اگر آپ کی دوستی اچھی نہیں ہے تو سماجی اقدار کا زوال لازم ہے۔ انھوں نے دوستی کو اللہ کی بندگی سے ربط دیتے ہوئے کہا ہے کہ ہم اللہ کی دوستی اور بندگی کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن عمل یہ ہے کہ اس حقیقی دوست اللہ کی پکار یعنی اذان کا احترام نہیں کرتے جبکہ ہمیں اذان پر لبیک کہتے ہوئے مسجدوں کا رخ کرنا چاہئے اور اللہ کی بندگی اور دوستی کا عملی ثبوت پیش کرنا چاہئے جیسا کہ قرآن میں سورۂ جمعہ میں حکم ہے کہ 'جب تمہیں اللہ کی طرف پکارا جائے تو سب کچھ چھوڑ کر نماز کی طرف دوڑ پڑو'۔ عشرتؔ قرآن کے اس حکم سے اپنے سماج کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور اس سماج کے ہر فرد کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر دوستی کا مفہوم سمجھنا ہو تو کربلا آؤ اور دیکھو کہ بندگی اور دوستی کسے کہتے ہیں۔ یہ کربلا ہمیں دوستی بھی سکھاتی ہے اور شعور بندگی بھی:

کی نہ اچھی دوستی تو بڑھ گئی اتنی زباں
سر پہ رکھے پھر رہے ہیں نفرتوں کا آسماں
یہ ہماری قوم کے ہیں کتنے اچھے نوجواں
ہوٹلوں میں بیٹھ کر سنتے ہیں آوازِ اذاں

مسجدیں کہتی ہیں آ کر دوستی ہم سے کرو
سر کو سجدے میں جھکا کر دوستی ہم سے کرو

تم ہماری بات مانو اور یہ کر لو عہد آج
مسجدیں جب بھی پکاریں چھوڑ دو سب کام کاج

یہ نمازیں حشر میں ہونگی تمہارے سر کا تاج
کام آ سکتے نہیں دنیا کے یہ رسم و رواج
دوستی اللہ سے کر لو تو بیڑا پار ہے
ورنہ دنیا ہی تمہارے واسطے اک نار ہے
دوستی کا کربلا والو ں نے رکھا ہے بھرم
بڑھ نہیں پائے بغیر مرضیٔ سرور قدم
ہم ہیں ان کے ماننے والے مگر افسوس ہم
دوستی کے نام کو کرتے ہیں رسوا دم بدم
کربلا والوں سے درسِ دائمی لیتے نہیں
مجلسوں سے بھی شعورِ بندگی لیتے نہیں

شاعر چونکہ سماج کا ترجمان ہوتا ہے اس لئے عشرتؔ نے بھی اپنے مرثیوں میں ان سماجی مسائل کو خاص جگہ دی ہے جو سماج کے نوجوانوں میں علت بن کر سرایت کر گئے ہیں۔شراب نوشی مخربِ اخلاق ہے۔ یہ ایسی بیماری ہے جسے اپنا کر انسان شرافت کے جامے سے باہر ہو جاتا ہے ۔عشرتؔ اس بیماری کو نوجوانوں میں بڑھتا ہوا دیکھ کر کافی فکر مند ہیں۔شراب ایسی شئے ہے جسے انسان پہلے پیتا ہے لیکن بعد میں شراب انسان کو پی جاتی ہے۔شراب پی کر انسان ، انسان نہ ہو کر جانور سے بدتر بن جاتا ہے اور اکثر رشتوں کا احترام بھی نہیں کرتا۔عشرتؔ نے ایک مرثیہ 'شرابِ مودت' کے عنوان سے کہا ہے جس کے چہرے میں شراب ،اس کی حقیقت ،اس کے مضر اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

آؤ تمہیں بتائیں حقیقت شراب کی — بے موت مار دے گی تمہیں لت شراب کی
آنے نہ دو قریب نحوست شراب کی — نسلیں بگاڑ دیتی ہے عادت شراب کی

برباد زندگی کا ہر اک ماہ و سال ہے
منھ لگ گئی اگر تو چھڑانا محال ہے

عشرتؔ کا خیال ہے کہ یہ ایک ایسی لت ہے جس کی وجہ سے مالی خسارے کے ساتھ ساتھ انسان سماج میں بھی ذلیل وخوار سمجھا جاتا ہے۔شرابی کو نہ صرف سماج میں برا سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کی اولاد پر بھی اس علت کا اثر پڑتا ہے اور یہ ایسی ذلیل عادت ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے اس لئے نوجوانوں کو شراب سے دور رہنے کی عشرتؔ تلقین کرتے ہیں:

رہنا ہے ٹھوکروں میں تو پیتے رہو شراب — تم اپنی زندگی کو بناتے رہو عذاب
خود تم نے کر لیا ہے تباہی کا انتخاب — ہر ہر قدم پہ تم کو ملے گا نیا عتاب
ہر محفلِ حیات میں ذلت اٹھاؤ گے
جاؤ گے تم جہاں وہاں دھتکارے جاؤ گے
اچھے بنو قریب نہ لاؤ شراب کو — بھولے سے بھی نہ ہاتھ لگاؤ شراب کو
آ جائے سامنے تو ہٹاؤ شراب کو — موضوع زندگی نہ بناؤ شراب کو
دل ہی نہیں ضمیر کو ناپاک کرتی ہے
چڑھ جاتی ہے تو فکر کو سفاک کرتی ہے
دنیا میں کیجئے نہ جہنم کا انتخاب — گھیریں گے آ کے چاروں طرف سے نئے عذاب
پڑھئے کبھی تو اپنے بھی اعمال کی کتاب — یوں ہی اگر شراب میں ڈوبے رہے جناب
منھ میں حلال کوئی نوالا نہ جائے گا
بچے بگڑ گئے تو سنبھالا نہ جائے گا

اس منظر نامے میں عشرتؔ نے شراب کے مضر اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے سماج

کے اس طبقے پر طنز کے تیر برسائے ہیں جو اپنے آپ کو امام حسینؑ کا عزادار اور اہل بیت رسولؐ کا دوست دار کہتا ہے۔ چند بیت ملاحظہ فرمائیں جس میں سماج کے اس طبقے کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت بھی ہے اور شاعر کا کرب بھی:

پی کر شراب حکم محمدؐ سے پھر گئے — اور اہل بیت پاک کی نظروں سے گر گئے
کس درجہ دل دکھاتے ہیں زہراؑ کے چین کا — جو حق ہے وہ ادا نہیں کرتے حسینؑ کا
فرش عزائے شاہ پہ آنا نہ چاہئے — تم کو غمِ حسینؑ منانا نہ چاہئے
پی کر شراب تم کو تو تسکین ہوتی ہے — قرآن و اہلِ بیت کی توہین ہوتی ہے

عشرتؔ کی نظر میں شراب نوشی کے ساتھ ساتھ نوجوانوں میں جوئے کی عادت کا ہونا بھی ہمارے سماج کے لئے ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ جبکہ دونوں علتوں سے قرآن نے باز رہنے کا حکم دیا ہے لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے نوجوان ان دونوں علتوں کے شکار ہو رہے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ رحمتِ خداوندی سے دور ہو گئے ہیں اور نتیجتاً سماج میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں:

کچھ کو جوئے شراب کی عادت نے کھا لیا — جو بچ گئے تھے ان کو سیاست نے کھا لیا
کتنوں کو تو حرام کی دولت نے کھا لیا — رحمت نے ساتھ چھوڑا تو زحمت نے کھا لیا

لاٹھی پڑی جو حق کی تو تاراج ہو گئے
لب سل گئے شراب کو محتاج ہو گئے

لمحوں کی کوئی قید نہیں عمر بھر چلے — سینہ پھلا پھلا کے ادھر سے ادھر چلے
کتنوں کو تو حرام کی دولت نے کھا لیا — انجام کی خبر تھی مگر بے خبر چلے

جیسا عمل تھا ویسی سزا تم نے پائی ہے
خود اپنے ہاتھوں اپنی ہی تربت بنائی ہے

عشرتؔ نے جہاں دنیاوی شراب کی مذمت کی وہیں انھوں نے اپنے مرثیے میں کہا ہے کہ شراب ضرور پیو لیکن نجس شراب نہیں جس سے تم ذلیل و خوار ہو جاؤ بلکہ ایسی پاک شراب پیو جس کو پی کر دنیا بھی کامیاب ہو اور عقبیٰ بھی کامران ہو:

ایسی پیو شراب نہ ہو زندگی خراب — پینا ہی ہے تو عشق علیؑ کی پیو شراب
دنیا بھی کامیاب ہے عقبیٰ بھی کامیاب — اس میں فقط جزا ہے نہیں ہے کوئی عذاب

اس مئے کو پی کے ٹھوکریں کھاتا نہیں کوئی
اس مئے کو پی کے گھر کو جلاتا نہیں کوئی

روزہ نماز حج کی بشارت ہے یہ شراب — اک اچھی زندگی کی ضمانت ہے یہ شراب
جتنی بھی چاہے پیجے وہ نعمت ہے یہ شراب — سارے پیمبروں کی ضرورت ہے یہ شراب

اہلِ ولا کے واسطے قبلہ بنا دیا
پی کر جسے خلیلؑ نے کعبہ بنا دیا

عشرتؔ نے ایک مرثیہ 'سچ اور جھوٹ' کے عنوان سے کہا ہے جس میں سچ اور جھوٹ کی تفریق کرتے ہوئے لکھنؤ کے اس شعر و سخن کے ماحول کی عکاسی کی ہے جس سے موجودہ عہد میں شہرِ تہذیب دوچار ہے۔ عشرتؔ بذاتِ خود اس گنگا جمنی تہذیب کے پروردہ ہیں اس لئے انہیں اس شہرِ سخن کی محفلوں اور شعر فہمی کے زوال پذیر ماحول پر دکھ ہے:

بیٹھے ہیں محفلوں میں گویّے ادھر ادھر — استاد کتنے بیٹھے ہیں ان کو نہیں خبر
دولت بٹورنے کا مگر ہے بڑا ہنر — پڑھتے ہیں شعر خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر

شاعر نہیں ہیں جذبے ہیں اونچی اڑان کے
تارے زمیں پہ ڈھونڈتے ہیں آسمان کے

عشرتؔ کے مطابق شاعر کا فریضہ سماج کو صحیح راستہ دکھانا ہے لیکن افسوس ناک پہلو

یہ ہے کہ بہت سے شاعر اور ناظمِ محفل جھوٹ کا سہارا لے کر ان گویّے شعرا کو شاعرِ اعظم بنا دیتے ہیں جو ایک مصرع بھی نہیں کہہ سکتے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ محفلوں سے شعر سننے کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے اور مترنم لوگوں کو عوام سننا پسند کرتے ہیں:

دنیا میں ایسے چاہنے والے ہیں جھوٹ کے
روزی حرام منھ میں نوالے ہیں جھوٹ کے
رستے بڑے بڑوں نے نکالے ہیں جھوٹ کے
اب سچ کے کارخانوں پہ تالے ہیں جھوٹ کے
بازار میں ہیں جھوٹ کے سکّے ڈھلے ہوئے
ردّی کی ٹوکری میں ہیں سچے پڑے ہوئے

چونکہ سچے شعرا ردّی کی ٹوکری میں پڑے ہیں۔ ہر طرف جھوٹ کا بازار گرم ہے۔ جب جھوٹ کا ہر طرف دور دورہ ہے تو اس ماحول میں سماج کا کیا حال ہوگا بقول عشرتؔ:

بدلا ہوا ہے کتنا زمانے کا کام کاج
دنیا میں جھوٹ بولنے کا عام ہے رواج
کھیتوں میں بویا جاتا ہے اب جھوٹ کا اناج
ان لوگوں کے خلاف ضروری ہے احتجاج
جو جھوٹ کے خلاف بھی لب کھولتے نہیں
لٹکے ہیں پیر قبر میں سچ بولتے نہیں
یہ بات سوچ سوچ کے حیران ہے دماغ
شہرِ وفا میں بجھ گئے تہذیب کے چراغ

خالی پڑے ہوئے ہیں ضرورت کے سب ایاغ
جھوٹوں کی بستیوں میں شرافت ہے داغ داغ
سچی زبان والے سخنور کہاں سے لائیں
جو جوڑ دیں دلوں کو وہ رہبر کہاں سے لائیں

ان مرثیوں کے علاوہ عشرتؔ کے مجموعۂ مراثی 'فراتِ غم' میں ماتمِ حسینؑ، فلسفۂ موت و حیات، عباسؑ اور شجاعت، حسین اور امن اور خطبۂ زینب ایسے مراثی ہیں جس میں سماج کے متعدد مسائل پر کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔ انہوں نے کوشش کی ہے کہ ان مسائل کو پیش کر کے سماج کو ایک اچھا پیغام دیں تا کہ ہمارا موجودہ سماج مہذب سماج کہلا سکے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ہم اپنے مقصدِ تخلیق کو سمجھتے ہوئے اسلامی سماج کی تعمیر و تشکیل میں اہم رول ادا کریں۔

○○○

'ایک قطرہ خون' پر ایک نظر

عصمت چغتائی کی ادبی زندگی کی شروعات ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانہ میں ہوئی۔ انہوں نے مارکسی نظریات سے متاثر ہوکر سرمایہ دار طبقے کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنی تحریروں سے جدید تعلیم اور مغربی اثرات کو نوجوانوں میں بڑھاوا دیا جس کی وجہ سے ادب میں جنس کو ایک اہم موضوع کی حیثیت حاصل ہوئی۔ عصمت کے افسانے جنسی حقیقت نگاری کی مثال ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں کا موضوع جنس ہے اور انہوں نے اس کا اظہار اس قدر بے باکانہ انداز سے کیا کہ آگے چل کر اسے فحاشی کا نام دیا گیا۔

ان کے ناولوں اور افسانوں کا موضوع عام طور سے متوسط مسلم گھرانے کی لڑکیوں کی جنسی زندگی ہے۔ عصمت خود بھی ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں لیکن ان کے خیال میں ان کا گھر دوسرے متوسط گھرانے کے مقابلے زیادہ آزاد خیال تھا جس کے نتیجے میں عصمت کے قلم نے ایسی کہانیاں اور ناول لکھے جس کے لئے وہ بیک وقت بدنام بھی ہوئیں اور نام بھی کمایا۔ غرض موضوعات کی بے باکی اور لہجے کی تیزی وطراری ان کی شخصیت کی پہچان بن گئی۔

عصمت نے ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصومہ، سودائی، عجیب آدمی اور 'دل کی دنیا' جیسے ناول لکھ کر اردو ادب میں اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے لیکن اپنے مخصوص مزاج اور انداز بیان سے ہٹ کر ایک منفرد تاریخی ناول ''ایک قطرہ خون'' (۱۹۷۶ء) لکھا جس کا موضوع اسلامی

تاریخ کا عظیم الشان واقعہ کربلا ہے۔

عام طور سے تاریخی ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کا موضوع اسلاف کے کارناموں کو بنایا ہے تاکہ اس کے ذریعہ یہ قوم اپنے شاندار ماضی کی تصویر دیکھے اور اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکے۔ تاریخی ناول کے عنوان سے ہمارا ذہن تاریخ کے کسی خاص واقعہ، کسی خاص دور کسی خاص تاریخی شخصیت کی طرف ملتفت ہوتا ہے۔

زیر نظر ناول 'ایک قطرۂ خون' بھی ایسا ہی ناول ہے جو اسلامی تاریخ کے ایک مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ واقعۂ کربلا نہ صرف یہ کہ تاریخ انسانیت کا ایک اہم واقعہ ہے بلکہ اس کا تعلق مذہبی عقیدت سے بھی ہے۔ اس واقعہ کی ہمہ گیری ہی کی وجہ سے شاعری کی ایک اہم صنف مرثیہ اس واقعہ سے منسوب ہوگئی۔ یہاں پر مرثیے کی تاریخ پیش کرنی نہیں ہے لیکن اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ اردو ادب میں امام حسینؑ اور کربلا کو ایک علامت کے طور پر اپنایا جا چکا ہے اور حسینؑ و یزید، مظلوم و ظالم، اجالے اور اندھیرے، حق اور باطل کا استعارہ بن چکے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ عصمت کا موضوع متوسط مسلم معاشرے کی جنسی زندگی ہے لیکن ''ایک قطرہ خون'' ان کے مخصوص مزاج سے قطعی مختلف ہے۔ اس ناول کی وجہ تصنیف عصمت کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

> ''میں نے ابتداء میں گھریلو الجھنوں پر، لڑکیوں پر، بال بچوں پر بہت کچھ لکھا۔ جب میں بمبئی آئی تو مجھ پر کمیونسٹ پارٹی کا اثر ہوا اور میں نے لال جھنڈے کی طاقت سے مرعوب ہوکر بہت سی ایسی کہانیاں لکھیں جن کا رنگ میری پرانی کہانیوں سے مختلف تھا۔ پھر میں فلم میں غرق ہوگئی اور میں نے فلمی ماحول پر کہانیاں اور ناولیں

لکھیں ۔آہستہ آہستہ میرا جی ان سب موضوعات سے اکتا گیا۔
جب لکھنے کو کچھ نہ رہا تو میں نے انیسؔ کے مرثیے پڑھنے شروع
کئے پانچ جلدیں پڑھیں جن میں مجھے امام حسینؑ کی بڑی دل چھو
لینے والی کہانی نظر آئی ۔ پھر میں محرم کی مجلسوں میں شریک ہوئی
بہت سے ماتم دیکھے جلوس دیکھے، میں نے سوچا کہ وہ کیا چیز تھی
جس نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا۔وہ مومنٹ کیا تھی اس کو ذہن میں
رکھ کر میں نے ایک ناول لکھی ''ایک قطرہ خون'' جس میں ایک
شخص نے چودہ سو برس پہلے سامراجی طاقتوں کا کن ہتھیاروں
سے مقابلہ کیا، گردن کٹائی مگر سر نہ جھکایا، پورے خاندان کو مٹایا۔
اگر چہ اور بھی بڑے بڑے سانحے گذرے ہیں لیکن ان کو بھلا دیا
گیا.....یہ واقعہ آج تک اتنا تازہ معلوم ہوتا ہے کہ کل ہوا۔ میں
نے واقعہ کو ناول کی شکل دے دی''۔(۱)

عصمت کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سانحہ میں ایک طرف سامراجی طاقت کے خلاف ایک فرد کی نبرد آزمائی دیکھی اور وہ بھی آج سے چودہ سو برس پہلے۔ دوسرے انہیں اس بات نے متاثر کیا کہ بلاتفریق مذہب وملت لوگ اس واقعہ کی یاد کو تازہ رکھے ہوئے ہیں۔

عام طور سے تاریخی ناول نگار سے قاری کا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ ان تاریخی واقعات کو حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے اس طرح پیش کرے کہ قاری واقعہ کے اسباب وعلل کو محسوس کرنے لگے۔ جہاں تک ''ایک قطرہ خون'' کا تعلق ہے عصمت نے اس پہلو پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی اس لئے کہ انہوں نے زیادہ تر انحصار انیسؔ کے مرثیوں پر کیا ہے۔ اس حقیقت کا

اعتراف بھی ضروری ہے کہ عصمت نے عورتوں کے مسائل پر بہت کھل کر لکھا ہے اور صنف نسواں پر ظلم وزیادتی کی کھل کر مخالفت کی ہے۔عصمت نے اس ناول کی ابتداء ہی میں مسلم معاشرے پر کڑی تنقید کی ہے ''طلوع'' کے عنوان سے انہوں نے جہاں امام حسینؑ کی ولادت کا ذکر کیا ہے وہیں پر جناب فاطمہ کی پرورش اور ان کے تئیں سرکار ختمی مرتبت کا عزت واحترام بھی قابل دید ہے۔ وہ عرب جہاں لڑکیوں کو باعث ننگ وعار سمجھا جاتا ہو اس سماج میں اللہ کا رسولؐ اپنی بیٹی کا احترام کر کے یہ بتا رہا تھا کہ بیٹیاں باعث ذلت نہیں بلکہ قابل احترام ہیں۔ جناب فاطمہؑ کے لئے اللہ کے حبیبؐ کا تعظیم کے لئے کھڑا ہونا اور بیٹی کو وہ سارے حقوق دینا جو ایک مہذب سماج کے لئے ضروری ہیں عصمت کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''پیغمبر اسلام نے اپنی بیٹی فاطمہ زہرا کو بڑے ناز ونعم سے پالا تھا۔
یہ وہ زمانہ تھا جب عرب وحشی اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے
تھے۔لڑکی ذات کو منحوس اور ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ زمانۂ جہالت کی
اور دوسری لعنتوں کے ساتھ رسولؐ خدا نے اس بیہودہ رسم کے
خلاف بھی آواز بلند کی ۔ اپنے قول وفعل سے ثابت کرنے کے
لئے انہوں نے اپنی بیٹی کو وہ سارے حقوق دیے جو ایک انسان کو
مہذب دنیا میں ملنا چاہیے ۔ وہ ان سے بے انتہا محبت کرتے
تھے۔انہیں بڑے شوق اور انہماک سے علم کی دولت سے مالا مال
کیا۔ان کی بڑی عزت کرتے تھے ۔ بیٹی کو آتا دیکھ کر ہمیشہ تعظیم
سے کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔جن کے قدموں میں شہنشاہوں
کے سر جھکتے تھے انہیں بیٹی کی اس طرح عزت کرتے دیکھ کر لوگ
اپنی بیٹیوں کی وقعت کرنے لگے تھے ۔ بیٹی کا باپ ہونا گالی نہیں

ایک قابل فخر بات سمجھا جانے لگا''۔(۲)

اس اقتباس کے مطالعہ سے اس دور کی بعض صورت حال پر روشنی تو پڑتی ہے۔ لیکن کوئی واضح نقش نہیں ابھر پاتا۔ اگر عصمت کی اسلام کی ابتدائی تاریخ، خلفائے عہد کی سیاسی وسماجی صورت حال اور یزید کی تخت نشینی اور اس کے شب وروز وعقائد پر گہری نظر ہوتی تو یہ ناول زیادہ بہتر ہوتا۔ انہوں نے واقعات کے انتخاب اور زبان دونوں سطح پر انیسؔ کی پیروی کی ہے جس کا اعتراف انہوں نے خود کیا ہے:

''میں نے انیسؔ کا انداز بیان چرانے کی کوشش کی ہے اور اپنا انداز بالکل بدل دیا ہے، کوشش کی ہے کہ میرا ایک جملہ نہ آنے پائے۔ اپنے دل سے کچھ نہیں لکھا۔ سب کچھ کتابوں سے لیا ہے''(۳)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ عصمت نے کچھ کتابوں کا سہارا لیا ہے۔ لیکن ناول کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زیادہ تر انیسؔ کے مرثیوں سے استفادہ کیا ہے اور انہوں نے واقعۂ کربلا کا بھرپور مطالعہ نہیں کیا تھا، دوسرے اگر اس واقعہ پر کچھ فنکارانہ اضافے کرتیں تو ممکن تھا کہ وہ تاریخی واقعات سے ہٹ جاتیں اور ان پر مسلمانوں کا عتاب نازل ہوتا۔ اس لیے انہوں نے مرثیوں میں پیش کردہ تصورات سے الگ تھلگ ہونے کی شعوری کوشش نہیں کی بہرحال اس طرز اظہار کے اپنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناول کا بیشتر حصہ انیسؔ کے مرثیوں کی نثر محسوس ہوتا ہے۔ میر انیسؔ کا مشہور مرثیہ:

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے جلوہ کیا سحر کے رخ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہ گردوں رکاب نے مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو! فریضۂ سحری کو ادا کرو

یہ سن کے بستروں سے اٹھے وہ خدا شناس اک اک نے زیب جسم کیا فاخرہ لباس
شانے محاسنوں میں کیے سب نے بے ہراس باندھے عمامے، آئے امام زماں کے پاس
رنگیں عبائیں دوش پہ کمریں کسے ہوئے
مشک وزباد وعطر میں کپڑے بسے ہوئے
سوکھے لبوں پہ حمد الٰہی رخوں پہ نور خوف وہراس رنج وکدورت دلوں سے دور
فیاض، حق شناس، اولوالعزم، ذی شعور خوش فکر وبذلہ سنج و ہنر پرورو غیور
کانوں کو حسن صوت سے حظ برملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

یہ تین بند بطور مثال پیش کئے گئے ہیں۔ اب عصمت کی نثر ملاحظہ فرمائیں:

''جیسے ہی دنیا کو منور کرنے والے سورج نے سر اٹھایا، ستاروں کی چاندی اوس کی مانند آسمانی خلاؤں میں پگھل گئی ..... حسینؑ ابن علیؑ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور کہا۔ دوستوں، لو صبح ہوگئی خدا کی حمد وثنا کا وقت ہے۔ اٹھو فجر کی نماز ادا کریں ..... یہ سن کر سب بستروں سے اٹھ کھڑے ہوئے، لباس فاخرہ زیب تن کئے، بالوں میں کنگھی کی، عمامے باندھے، کاندھوں پر خوش رنگ عبائیں اور کمر میں ریشمی پٹکے ڈالے۔ جسموں کو عطر ومشک سے بسایا۔ چہرے تقدس کے نور سے روشن تھے اور پیاسے ہونٹوں پر خدا کا نام تھا''(۴)

انیسؔ کا بہت ہی مشہور شعر ہے:

پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی ساحل سے سر پٹختی تھیں موجیں فرات کی

عصمت لکھتی ہیں:

''فرات کی موجیں بے بسی سے ساحل پر سر پٹخ رہی تھیں''۔

انیسؔ کا ایک اور شعر ہے:

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

عصمت کی نثر ملاحظہ فرمائیں:

''امام یہ تو نہ کہہ سکے کہ میں رسولؐ خدا کا نواسہ شیر خدا کا فرزند اور فاطمہؑ زہرا کا لال ہوں بڑی انکساری سے سر جھکا کے بولے، میں حسینؑ ہوں''۔

انیسؔ کا ایک مشہور شعر ہے:

انکار آسماں کو ہے راضی زمیں نہیں اصغر تمہارے خوں کا ٹھکانا کہیں نہیں

منظر ہے اس وقت کا جب امام حسینؑ اپنے ششماہے بچے حضرت علی اصغرؑ کے لئے پانی مانگنے کے لئے فوج یزید کے پاس جاتے ہیں اور ابن سعد نے حرملہ کو حکم دیا کہ حسینؑ کے اس معصوم کو بھی شہید کر دو۔ بچہ باپ کے ہاتھوں پر شہید ہو گیا۔ امام حسینؑ علی اصغرؑ کا خون چلو میں لیتے ہیں اور آسمان کی طرف پھینکنا چاہتے ہیں۔ آواز آتی ہے اے حسینؑ اگر یہ خون ناحق آسمان کی طرف آیا تو قیامت تک ایک قطرہ پانی نہیں برسے گا۔ امام حسینؑ نے اس خون کو زمین کی طرف پھینکنا چاہا زمین نے بھی انکار کیا کہ اگر اس معصوم کا خون زمین پر گرا تو قیامت تک ایک دانہ نہ اگے گا۔ اب یہ منظر عصمت کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

''امامؑ نے حسرت سے ہر چہار طرف تھکی ہوئی نگاہ ڈالی اور بولے بیٹے اصغر ارض وسما کو تمہارے خون سے انکار ہے۔ تمہارے خون کا کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ میں زمین سے طاقت روئیدگی نہیں چھینوں گا! یہ کہہ کر خون اپنے چہرے پر مل لیا''۔(۵)

درج بالا مثالوں سے واضح ہو گیا ہو گا کہ واقعۂ کربلا کا پورا نقشہ جس طرح انیسؔ کے مرثیوں میں کھینچا گیا ہے، ہو بہو وہی تصویر عصمت نے نثر میں اتار دی ہے۔ اس سے قطع نظر واقعۂ کربلا کے ہر پہلو اور مرثیے کے تمام اجزا عصمت کے ناول میں موجود ہیں۔ جنگ کے بیان میں امام حسینؑ کی تلوار کے سلسلے میں لکھتی ہیں:

''حسینؑ کی تلوار تھی کہ قہر بداماں بجلی! سر پر موت کی صورت گرتی، پیروں تک اتر جاتی.... تلوار تھی کہ قہر خدا۔ ایسا تلاطم تو کبھی دریائے نیل کی موجوں نے بھی برپا نہیں کیا ہو گا..... لاشوں سے رن کی زمین کو پاٹتی صاف نکل جاتی۔ دشمن کا خون چاٹ کے اور بھی دلیر ہو گئی..... جتنا خون پیتی اور پیاس بڑھتی جاتی۔ ایک برق تھی جو ایک ہی وقت میں ہر چہار سو برس رہی تھی''۔(۶)

مرثیے کا ایک اہم جزو رخصت ہے عصمت نے بھی اس جزو کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا:

''زینبؑ نے ذوالجناح کی گردن میں باز و حمائل کر کے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کے کان میں کہا 'ذوالجناح میرے بیرن کا خیال رکھنا'۔ پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کے دوہری ہو گئیں .....'خدا تمہارا نگہبان میرے عزیزو'۔ امامؑ نے زیر لب فرمایا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ ذوالجناح اپنی جگہ سے ایک چاول بھر بھی نہ ہٹا..... اور تھوتھنی سے اپنے پچھلے پیروں کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ امامؑ نے جھک کر دیکھا تو ننھی سکینہؑ گھوڑے کے سموں کو تھامے سسکیاں بھر رہیں تھیں۔ کیا ہوا جان پدر؟ امامؑ گھوڑے سے اتر

پڑے۔ بابا بس ایک مرتبہ ہمیں اپنی چھاتی سے لگالو‘‘۔(۷)

عصمت کی اس نثر کو پڑھ کر میر انیسؔ کا درج ذیل بند یاد آجاتا ہے:

حسینؑ جب کہ چلے بعد دوپہر رن کو نہ تھا کوئی کہ جو تھامے رکاب توسن کو
حسینؑ چپکے کھڑے تھے جھکائے گردن کو سکینہ جھاڑ رہی تھی عبا کے دامن کو
نہ آسرا تھا کوئی شاہ کربلائی کو
فقط بہن نے کیا تھا سوار بھائی کو

امام حسینؑ اور ان کے ساتھی جو خودداری، شرافت، شجاعت، صبر وقناعت اور حق پرستی کا مجسمہ ہیں۔ ایک منظر امام حسینؑ کی مختصر سی فوج کا ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں شامل تقریباً تمام اہم لوگوں کا تعارف عصمت کے قلم نے بڑی خوبصورتی سے کرایا ہے:

’’اللہ اللہ کیا عجیب وغریب فوج تھی۔ گنتی کے چند افراد مگر ایک ایک اپنی جگہ بے مثال، دشمن کے ہزاروں پر بھاری، ایک ایک ہاشمی جوان اپنی مثال آپ تھا۔ ایک طرف خوب رو علی اکبرؑ تھے جنہیں سب ہم شکل پیغمبر کہا کرتے تھے۔ چہرے پر نوجوانی کے باوجود رعب و دبدبہ تھا۔ قاسم کی شان ہی نرالی تھی، کچھ بچپن تھا، کچھ آمد شباب کی حدت، جنگی پوشاک کا بوجھ کچھ عجب لگ رہا تھا۔ شیر خدا کے نواسے عون اور محمد کو اس کمسنی میں مسلح دیکھ کر کلیجہ مسل جاتا تھا، یہ عمر کھانے کھیلنے کی ہوتی ہے یا جنگ وجدل کی۔ کھلونوں سے کھیلنے والے ہاتھوں میں زمانے نے تلوار پکڑا دی تھی ذرا ذرا سے بچے دلیری اور شجاعت کا نمونہ بنے ہوئے تھے‘‘۔(۸)

عصمت نے اس ناول میں واقعۂ کربلا کی خواتین کو باہمت، دلیر اور صابر دکھایا

ہے ساتھ ہی ساتھ ان کے فطری جذبات کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ وہ کردار غیر حقیقی نہیں معلوم ہوتے۔ یہ عصمت کا کمال بھی ہے جو ان کی مخصوص زبان اور ان کے منفرد اسلوب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک منظر ملاحظہ فرمائیں۔ ہم شکل پیغمبرؐ حضرت علی اکبرؑ ماں کے پاس جاتے ہیں کہ بابا سے جنگ کی اجازت دلا دیں۔ ماں امام کے پاس آتی ہیں اور فرماتی ہیں:

’’میں نے آپ سے آج تک اپنے لئے کچھ نہیں مانگا، آپ مل گئے تو پھر رہ بھی کیا گیا، مانگنے کو۔ آج میں اپنے بیٹے کے لئے اس کا حق جہاد مانگتی ہوں، امامؑ خاموش ان کا منہ دیکھتے رہ گئے ....کیا سوچ رہے ہیں آقا۔ اللہ کا نام لے کر اجازت دے دیجئے۔ آپ رہتے تو میری دنیا رہتی۔ میرے ارمان سلامت رہتے، بیٹے کا بیاہ کرتی۔ پیاری سی دلہن بیاہ کر لاتی۔ خیر سے ہم دونوں پوتے کا چاند سا مکھڑا دیکھ کر جیتے۔ آپ نہ ہونگے تو کیسا بیاہ، کیسی شادی، بانو بغیر اپنے آقا کے کیا خاک زندہ رہے گی.....جاؤ علی اکبرؑ ہماری طرف سے اجازت ہے۔ امامؑ نے آہ سرد بھر کے کہا۔‘‘(۹)

اس نثری نمونے سے عصمت کے قوت اظہار، طرز ادا، زبان و بیان پر مکمل قدرت اور سجی ہوئی نثر لکھنے کے سلیقے کا اعتراف ناگزیر ہے۔ آخر میں ظ۔ انصاریؔ مرحوم کی رائے کو نذر قارئین کر کے اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔ انہوں نے لکھا ہے:

’’ایک قطرہ خون۔ ناول کیا ہے، لہو کی ایک بوند ہے جو ناول نگار عصمت چغتائی نے کربلا کے خونیں واقعات پر آنکھوں سے ٹپکائی ہے اور اگر محض ’’خون جگر کی نمود‘‘ سے فن پارے وجود میں آجایا

کرتے تو یقیناً یہ ایک کامیاب ناول ہوتا.....تمام کوتاہیوں کے باوجود ''ایک قطرہ خون'' ان پڑھنے والوں کو اپنے اندر جذب کر لینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے جو رسالت مآبؐ سے لے کر سید سجاد تک ۷۰ سال کے دوران اہم مذہبی روایات کو ایک تسلسل کے ساتھ کہانی کی طرح پڑھنا چاہتے ہیں''۔(۱۰)

ظ۔انصاری مرحوم کے اس اقتباس کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس ناول کا جو کچھ حسن ہے وہ نفس واقعہ ہی ہے۔عصمت کی یہ مجبوری تھی کہ واقعات کی ترتیب اور کردار نگاری میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کر سکتی تھیں۔لیکن اس عظیم واقعہ میں علامت بننے کی پوری گنجائش موجود ہے۔اردو شاعری میں امام حسینؑ اور واقعۂ کربلا کو بطور استعارہ کثرت سے شعریات کا حصہ بنایا جا چکا ہے اور علامتوں کے حوالے سے اس موضوع پر متعدد مقالے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں،لیکن فکشن میں اس پر کم توجہ کی گئی اور خاص کر ناول نگاروں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور دو ایک ناول لکھے گئے تو اس میں ناول نگار نے نفس واقعہ کو جو کچھ تاریخ اور مرثیے سے جانا اسے من وعن نثر میں بیان کر دیا۔

بہر حال عصمت نے یہ ناول لکھ کر آئندہ ناول نگاروں کے لئے ایک انوکھا موضوع پیش کر کے نئی جہت دکھائی ہے کہ اس واقعہ کو نئے انداز اور جدید اسلوب سے پیش کیا جا سکتا ہے یہ الگ بات ہے کہ خود مصنفہ یہ کام بخوبی انجام نہ دے سکیں۔

○○○

حواشی

(۱)عصمت چغتائی سے ایک ملاقات: ماہنامہ شاعر بمبئی:۱۹۷۶ء

(۲)ایک قطرہ خون:عصمت چغتائی: کتابی دنیا: دہلی:۲۰۰۲ء:ص۱۶۔۱۵

(۳)عصمت چغتائی سے ایک ملاقات: ماہنامہ شاعر بمبئی:۱۹۷۶ء

(۴)ایک قطرہ خون:عصمت چغتائی: کتابی دنیا دہلی:۲۰۰۲ء:ص۱۶۹

(۵)ایضاً:ص۲۵۲

(۶)ایضاً:ص۲۷۰

(۷)ایضاً:ص۲۶۳

(۸)ایضاً:ص۱۷۶

(۹)ایضاً:ص۲۳۳

(۱۰)کتاب شناسی: ظ۔انصاری: یونیورسل پریس بمبئی:۱۹۸۱ء:ص۲۳۶

مختصر سوانحی خاکہ

نام :عابد حسین
قلمی نام :عابد حسین حیدری
والد :جناب یعقوب حسین ابن محمد یوسف کربلائی مرحوم
والدہ :محترمہ خاتون بی بی بنت جناب محمد فرید مرحوم
اہلیہ :شہزادی بیگم
بیٹیاں :زینت زہرا، ایلیاز ہرا
بیٹے :محمد مفید، کمیل عابد
آبائی وطن :محلّہ نیا پورہ شیو پور گاڑا پوسٹ کوپا گنج ضلع مئو (یو. پی)
پیدائش :۱۰/نومبر ۱۹۶۸ء کوپا گنج، مئو۔

ابتدائی تعلیم:

میری ابتدائی تعلیم مدرسہ امامیہ کوپا گنج میں ہوئی اور مولوی جاوید مرحوم سے اردو اور دینیات کی تعلیم حاصل۔ قرآن کا ناظرہ حاجی عبید اللہ انصاری نے ختم کرایا۔ بعدہٗ مدرسہ مصباح العلوم کوپا گنج سے درجہ پنجم تک تعلیم حاصل کی استاد محترم ماسٹر عزیز الرحمٰن کی خصوصی توجہ سے درجۂ پنجم میں راقم نے پورے بلاک میں امتیازی نمبر حاصل کیا۔ بعدہٗ

مدرسہ جامع العلوم کوپا گنج سے عربی اول تک تعلیم حاصل کی۔اس درمیان عربی و فارسی بورڈ الہٰ آباد سے منشی کا امتحان شبلی کالج اعظم گڑھ سے دیا۔جس میں ممتاز نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔۱۹۸۲ء میں میرا داخلہ لکھنؤ کی مشہور علمی درسگاہ سلطان المدارس میں کرایا گیا اور یہیں سے میری صلاحتیوں میں نکھار آیا۔ مدرسہ سلطان المدارس سے سند الافاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد دو ماہی العلم کی ملازمت کے سلسلے میں ممبئ چلا گیا جہاں ۱۹۹۵ تک ملازمت کی (العلم کے مدیر مشہور محقق مجاہد آزادی علی جواد زیدی تھے) بعدہٗ ۱۹۹۵ء میں صدر الافاضل کی سند حاصل کی۔ مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ شعبۂ علوم مشرقیہ لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر ماہر، دبیر کامل اور فاضل تفسیر کے امتحانات دیئے اور ان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

اعلیٰ تعلیم :

بی۔اے	۱۹۸۹ء	شیعہ کالج لکھنؤ
ایم۔اے (اردو)	۱۹۹۱ء	لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ
نیٹ (NET)	۱۹۹۶ء	یو.جی.سی نئی دہلی
پی.ایچ.ڈی (اردو)	۲۰۰۶ء	لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

ملازمت :

☆**لکھنؤ میں** : پندرہ روزہ ''ہماری توحید'' سے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز ہوا جس کے ایڈیٹر مشہور سماجوادی لیڈر رام منوہر لوہیا کے ساتھی

چودھری سید سبط محمد نقوی تھے ۔ بعدہٗ ۱۹۸۷ء میں ہفتہ وار 'وظیفہ' لکھنؤ (انجمن وظیفۂ سادات ومومنین) کے جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت ملازمت کی ۔ وظیفہ کے ایڈیٹر غلام حسین (آئی اے ایس) سابق وائس چانسلر نریندر دیو زرعی یونیورسٹی فیض آباد تھے۔

☆ممبئی میں :۱۹۹۲ء میں چودھری سید سبط محمد نقوی کی ایماء پرمشہور صنعت کار سید اختر حسن رضوی کے ذریعہ نکالے جانے والے رسالہ ''دو ماہی العلم'' میں جوائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کی ۔اس رسالے کے مدیر مشہور محقق وادیب پدم شری علی جواد زیدی مرحوم تھے ۔ یہ رسالہ ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۵ تک بڑی آب وتاب سے نکلا اوراس کا مرثیہ نمبرومرثیہ سلام نمبر، شہادت نمبراورنعت خیرالمرسلین نمبرکی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔

☆لکھنؤ واپسی : ۱۹۹۵ء میں لکھنؤ واپس آ کر روز نامہ ''صحافت'' لکھنؤ میں بحیثیت سب ایڈیٹر ملازمت شروع کی اور اس دوران یونس اختر قدوائی سلامت رضوی، سید طاہرعباس اورعرفان صدیقی جیسے صحافیوں کی رفاقت میں کام کیا۔ ۱۹۹۸ء میں برادرمحترم محمد علی کی ایما پرلکھنؤ ، دہلی اورممبئی سے شائع ہونے والے دیوناگری اوراردو اخبار ہفتہ وارجدید مرکز (ایڈیٹرحسام الاسلام صدیقی) میں بحیثیت نیوز ایڈیٹرملازمت کی اور یہ سلسلہ ۱۲/جنوری ۲۰۰۱ء تک جاری رہا۔

☆سنبھل میں

اترپردیش ہائرایجوکیشن الہٰ آباد سے منتخب ہوکر بحیثیت لیکچررایم.جی.ایم کالج سنبھل میں ۱۵/جنوری ۲۰۰۱ء سے اب تک درس و تدریس کا

سلسلہ جاری ہے۔اس دوران اہل سنبھل نے جس فراخ دلی اورمحبت کا ثبوت دیا ہے اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔متعدد بارمختلف تقریبات میں نہ صرف یہ کہ اعزاز سے نوازا بلکہ ۳۱/جنوری ۲۰۱۵ء کو'انجمن باغ ادب سنبھل' اور' قمر رئیس عبدالصمد ٹرسٹ' نے 'جشن عابد حیدری' کا انعقاد کیا۔توفیق آزاد ایڈوکیٹ نے اس جشن کی تاریخ کہی:

اہل دانش نے منایا جشن عابدحیدری　　جوش فنکاروں میں لایا جشن عابدحیدری
جشن کی تاریخ کہہ دی خوب یہ توفیق نے　　باغ طاہر نے سجایا جشن عابدحیدری

۲۰۱۵ء

انتظامی عہدے :

صدرشعبۂ اردو : ایم.جی.ایم.(پی.جی) کالج سنبھل ۱۵/جنوری ۲۰۰۱ء سے اب تک
پروگرام آفیسر : این.ایس.ایس.(بوائز یونٹ)،ایم.جی.ایم.کالج سنبھل ستمبر ۲۰۰۳ء سے مارچ ۲۰۰۷ تک
پراکٹر : ایم.جی.ایم.کالج سنبھل جولائی ۲۰۰۲ء سے جون ۲۰۰۷ء تک
چیف پراکٹر : ایم.جی.ایم کالج سنبھل جولائی ۲۰۰۷ء سے اب تک
صدر :ٹیچرس ایسوسی ایشن ایم.جی.ایم.کالج سنبھل جولائی ۲۰۰۷ء سے اب تک
پی آئی او : ایم.جی.ایم.کالج سنبھل جولائی ۲۰۱۲ء سے اب تک
رکن : سلیبس کمیٹی ایم.جے.پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی ۱۰-۲۰۰۹ء
سکریٹری :انٹرکالجس والی وال چیمپین شپ ایم.جے.پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی ۲۰۰۶ء-۲۰۰۵ء
کنوینر :NAAC کمیٹی ایم.جی.ایم کالج سنبھل ۲۰۱۳ء سے اب تک

کنوینر :U.G.C. رمیڈیل کورسز ۰۹۔۲۰۰۸ء ایم.جی.ایم.کالج سنبھل

کنوینر : کیریئر کونسیلنگ سیل ایم.جی.ایم.کالج سنبھل ۲۰۱۱ء سے ۲۰۱۵ء

رکن :بورڈ آف اسٹڈیز ایم.جے.پی.روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی
۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۱ء و ۲۰۱۵ء سے اب تک

آبزرور :اتر پردیش B.Ed. کامن ٹیسٹ ۲۰۱۲ء

آبزرور :امتحانات ڈسٹینس ایجوکیشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۲۰۱۲ء سے اب تک
(متعدد سیکشن کمیٹی اور انسپکشن کمیٹی میں بحیثیت ممبر)

تصنیفات و تالیفات

- زراعت ظرفی (۱۹۹۲ء)
- ادبیات کشمیر (۱۹۹۴ء)
- علم سیاست (۱۹۹۵ء)
- علم نفسیات (۱۹۹۵ء)
- ارمغان محسنؔ (مجموعۂ مراثی محسنؔ زیدپوری) (۱۹۹۹ء)
- اردو میں شخصی مرثیے کی روایت (۲۰۰۸ء)
- علی جوادزیدیؔ: شخص اور شاعر (۲۰۰۹ء)
- رثائیات، تجزیات، شخصیات (۲۰۱۱ء)
- دبستان زیدپور کی مرثیہ گوئی (۲۰۱۴ء)
- شاگرد دبیرؔ: زکی بلگرامی (۲۰۱۵ء)
- میرے تجزیاتی اوراق (مجموعۂ مضامین) (۲۰۱۵ء)

- رثائی تحائف (مجموعۂ مضامین) (۲۰۱۵ء)
- اردو کے منتخب شخصی مرثیے (۲۰۱۵ء)
- سروشؔ کی رباعیاں (زیرطبع)
- علی جوادزیدی: ایک مطالعہ (زیرترتیب)
- نوحے کا ارتقائی سفر (زیرترتیب)

صحافت

☆بطور صحافی پرنٹ میڈیا میں ۱۵؍سال کا تجربہ

متعدد روزناموں ہفت روزہ اور ماہناموں میں خبرنویسی اور ادارت کے فرائض انجام دئے جن میں ہفتہ وار وظیفہ لکھنؤ۔ پندرہ روزہ ہماری توحید لکھنؤ، دوماہی العلم ممبئی ہفت روزہ جدید مرکز دہلی۔ ممبئی لکھنؤ، روزنامہ علی الصبح لکھنؤ اور روزنامہ صحافت لکھنؤ میں بحیثیت سب ایڈیٹر، جوائنٹ ایڈیٹر اور نیوز ایڈیٹر خدمات انجام دیں۔

مضامین :

☆قومی رسالے ۴۰

☆بین الاقوامی رسالے ۱۰

☆کتابوں میں شامل مضامین ۱۰

فیلوشپ:

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے پروجیکٹ ''ہماری قومی شاعری'' جلد اول (مرتبہ علی جوادزیدی) کیلئے اردو اکادمی نے راقم کو دو سال کیلئے فیلوشپ دی۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کی زیادہ تر لائبریریوں میں

مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

سیمینار میں شرکت :

☆قومی ۳۰

☆بین الاقوامی ۸

سیمینار کا انعقاد :

☆ تین قومی اور ۵/کالج سطح کے سیمنار منعقد کرائے۔

رسائل و جرائد شائع کیے :

☆ایم.جی.ایم کالج سنبھل سے سالانہ میگزین 'سنگم' کا اجرا ۲۰۱۲ء میں کیا۔جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

غیر ممالک کے اسفار

☆عراق،ایران اور نیپال

انعامات و اعزازات:

☆نیشنل اسکالرشپ ایوارڈ ۱۹۹۱۔۱۹۹۰ء

☆اودھ پنچ ایوارڈ ۱۹۹۷ء، ادارۂ شعروادب لکھنؤ

☆اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کا انعام ۲۰۰۹ء (برائے اردو میں شخصی مرثیے کی روایت)

☆ساہتیہ رتن ۲۰۱۴ء- سامانیہ گیان پرتیوگیتا اتر پردیش، سنبھل

☆اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کا انعام ۲۰۱۴ء (برائے دبستان زید پور کی مرثیہ گوئی)

☆ستون ادب ۲۰۱۵ء- انجمن باغ ادب، سنبھل،

رابطہ

DR. ABID HUSAIN HAIDARI
HOD Urdu M.G.M. (P.G.) College, Sambhal
Add: ALIYA MENTION, ABBASI TOLA, KOT (W)
Sambhal, 244302(U.P.) INDIA
Mob: 09411097150,
E:mail-drabidhusain@gmail.com